قلبِ پنہاں
از حمنہ صبور عامر

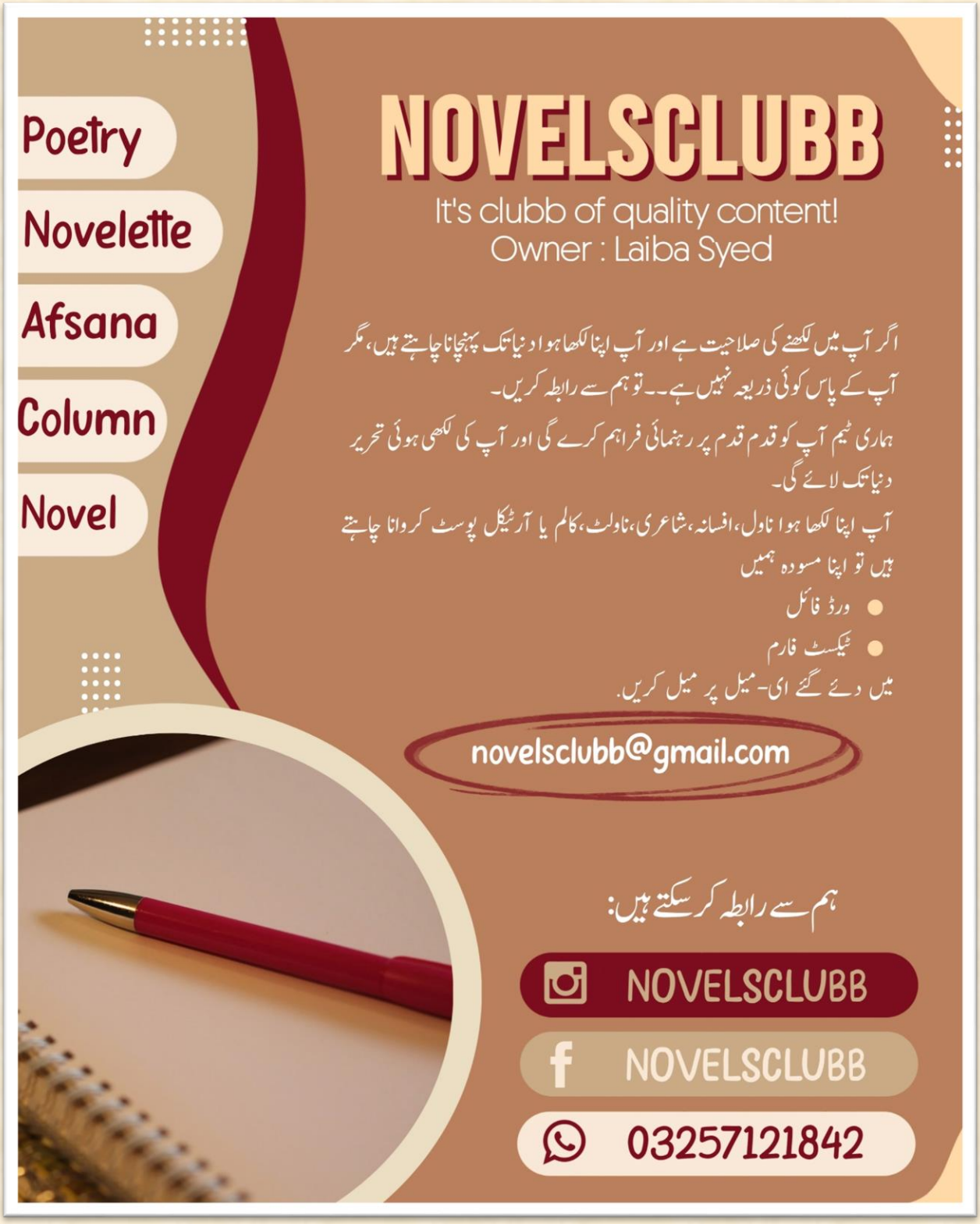
Poetry
Novelette
Afsana
Column
Novel
NOVELSCLUBB
It's clubb of quality content!
Owner : Laiba Syed
اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔تو ہم سے رابطہ کریں۔
ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔
آپ اپنا لکھا ہوا ناول، افسانہ، شاعری، ناولٹ، کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں
ورڈ فائل
ٹیکسٹ فارم
میں دئے گئے ای-میل پر میل کریں.
novelsclubb@gmail.com
ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں:
NOVELSCLUBB
NOVELSCLUBB
03257121842

قلبِ پنہاں

از قلم

حمنہ صبور عامر

ناولز کلب
Clubb of Quality Content

انتساب

"اللہ کی طرف سے عطا کردہ ہمت کے نام۔۔!"

ناولز کلب
Clubb of Quality Content

قلبِ پنہاں

از قلم: حمنہ صبور عامر

قسط نمبر ۲

باب اوّل

"سیاہ گلابوں کا گلدستہ"

ناولز کلب
Clubb of Quality Content

دوپہر کی نرم دھوپ پہاڑوں کی چوٹیوں سے پھسلتی ہوئی سارے میں اتر رہی تھی۔ سورج آسمان کے وسط میں تھا، مگر اس کی روشنی میں ایک عجیب سی نرمی تھی۔ جیسے فطرت خود تھکن اتار رہی ہو۔ دریا کی لہریں سنہری چمک کے ساتھ بہہ رہی تھیں، اور ان کے کنارے بیٹھے چرواہے اپنے ریوڑ کو سست دوپہر کے خواب میں لے جا رہے تھے۔ اونچے اونچے

پہاڑوں کی نوکیلی چوٹیاں سرسبز اور ہری بھری تھیں۔ ہوائیں یوں سرد تھیں جو جسم و جان کو تازگی بخش دیں۔ یہ ماحول بندۂ بشر کو جنت کا گمان دیتا تھا۔ فضا میں لکڑی جلنے کی خوشبو، نم مٹی کی مہک، اور پہاڑی ہوا کی خنکی ایک ایسا منظر تخلیق کر رہی تھی جو دل کو چھو جائے۔ یہ وہ لمحہ تھا جب وقت تھم سا گیا تھا، صرف فطرت بول رہی تھی، اور ہر چیز خاموشی سے اس کی بات سن رہی تھی۔

یہ دِیر تھا۔

وادیٔ سوات سے دو سو کلو میٹر کی دوری پر واقع ایک خوبصورت علاقہ۔

ذرائع بتاتے ہیں کہ نام ''دیر'' عربی لفظ سے آیا ہے جس کا مطلب ہے عبادت کی جگہ یا خانقاہ ۔ جہاں کوئی شخص تنہائی میں رہ سکتا ہے۔ ایک اور نظریہ یہ ہے کہ یہ فارسی لفظ ''ڈیر'' سے آیا ہے۔ جس کا مطلب ہے ''دور'' اور ''پہنچنا مشکل''۔ جو علاقے کی جغرافیائی دور کی عکاسی کرتا ہے۔ تاریخ میں دیر کے نام کو کسی نواب کے نام کے ساتھ بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت محض یہ ہے کہ دیر اپنے منفرد نام کے ساتھ ساتھ منفرد شہر بھی ہے۔ عام سیاحوں کی آنکھوں اور پہنچ سے دور اور قدرت کے نہایت قریب۔

تصور کی آنکھ کھولیں تو پردے پر دکھائی دیتے دیر کے اس حسین علاقے کے رہائشی حصے میں واقع ایک پرانا، قدیم ہری بھری گھاس اور سرسبز درختوں کی نرم چھاؤں کے سائے میں یہ گھر نہایت سکون پرور تھا۔ یوں جیسے اس گھر کے افراد تمام فکروں سے آزاد ہو کر زندگی گزارتے ہوں۔ دوپہر میں بھی قدرت کے محافظ درختوں نے اس گھر کو اپنی مامتا آمیز چھاؤں میں سمیٹ رکھا تھا۔ ان کا سایہ دل و دماغ پر محبت سے تھپکی دیتا محسوس ہوتا تھا۔ گھاس سے مزین اس گھر کا برآمدہ پار کر کے اندر آؤ تو مخملی و ریشمی میرون رنگ کے فرش پوش قالینوں سے آراستہ ایک وسیع صحن تھا جہاں زمین پر لکڑی کے بڑے بڑے تختے رکھے تھے۔ یہ اس گھر کی زمینی مجلس تھی جہاں گھر کے افراد بیٹھا کرتے تھے۔ گردن اٹھا کر دیکھو تو صحن کی چھت مکمل طور پر اوپر سے بند تھی۔ لیکن بیرونی دیواروں پر کھڑکیاں موجود تھیں جن کے بند ہونے کی وجہ سے سرد ہوا اندر نہیں آسکتی تھی۔ سرد ہواؤں کے فقدان کی بدولت ماحول مناسب گرم درجہ حرارت اختیار کر چکا تھا۔ صحن میں ایک جانب اوپر کو جاتی سیڑھیاں تھیں جن کے آخر میں دروازہ لگا تھا۔ یہ چھت کو جاتا تھا۔ موجودہ صحن گھر کا پچھلا حصہ تھا جس کو بیٹھک کی شکل دی گئی تھی۔ تین کمرے اس صحن کا حصہ تھے جن کے دروازے اس وقت

بند تھے۔ سردی ابھی صحیح طرح آئی نہیں تھی لیکن اس گھر کے افراد کو شاید سردی بہت لگتی تھی جو دروازے بند کیے بیٹھے تھے۔ صحن میں دو افراد زمینی تخت پر بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے وہ دو عورتیں تھیں جن میں سے ایک خاصی عمر کی تھیں۔ اس وقت جھنجھلاہٹ کے عالم میں کچھ کہہ رہی تھیں۔

"میں اس کی کھال ادھیڑ دوں گی اگر اس نے آئندہ ایسی کوئی بھی بات کی تو۔" وہ سخت برہم نظر آتی تھیں۔ وہ عمر رسیدہ عورت تھیں جو اس وقت چادر سر پر لپیٹے ہوئے تھیں۔

"اس چھٹانک بھر کی لڑکی کو لگتا ہے کہ ہمارے سامنے ضد باندھے گی اور ہم مان لیں گے؟ اس کی خوش فہمی میں ابھی دور کرتی ہوں۔ دیکھتے ہیں کیسے نہیں ہٹتی اپنے موقف سے۔"

دوسری عورت جوان تھی۔ گلے اور ہاتھوں میں اس نے سونا پہن رکھا تھا۔ وہ شادی شدہ دکھائی دیتی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تیز تیور لئے ایک دروازے کی طرف بڑھی تھی۔

اور جس چھٹانک بھر کی لڑکی کے بارے میں بات ہو رہی تھی، وہ اپنے پسندیدہ کاموں میں سے ایک کو انجام دینے میں مصروف تھی۔ ہر سوچ کو بھاڑ میں جھونکے اور ہر خیال کو آگ لگائے۔ جس کمرے کی طرف وہ عورت بڑھی تھی، اس کمرے کے بند دروازے کے اندر

آئیں تو مٹیالی بھوری دیواریں اس کے شوق کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ کئی چھوٹے بڑے لکڑی کے فریم والے کینوس دیواروں پر سجے تھے۔ یہ نہایت ہلکے بھورے رنگ کے کپڑے کے کینوس تھے جو عام کینوس کی طرح سخت ہونے کی بجائے ڈھیلے ڈھالے تھے۔ یہ ایک ٹیپسٹری کی طرح لگتے تھے لیکن اس سے بہت منفرد تھے۔اس وقت کمرے میں مدھم سی آواز میں نصرت فتح علی خاں کی پر سوز غزل کی آواز گونج رہی تھی۔ جس نے ماحول کو دم سادھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ان کے اندازِ کرم ، ان پہ وہ آنا دل کا

ہائے وہ وقت وہ باتیں وہ زمانہ دل کا

کمرہ چلچلاتی دوپہر میں نرم گرم روشنی میں ڈوبا تھا۔ مکین نے صحن کے برعکس کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول رکھی تھیں۔ زمین پر قالین بچھا تھا اور کمرے کے ایک کونے میں میز اور کرسی رکھے تھے۔ کمرے کے وسط میں دو سنگل بیڈ پڑے تھے جن کی چادریں نفاست سے بستر پر بچھی تھیں۔ دیواریں مٹیالے رنگ کی تھیں جن کی وجہ سے دوپہر ہونے کے باوجود شام کا گمان ہوتا تھا۔ کمرہ بے حد پر سکون اور خاموش تھا۔ سوائے نصرت کی اس غزل کے کمرے

میں کوئی آواز نہ آتی تھی۔اس دلفریب منظر کا دلکش حصہ وہ خود تھی جو اس وقت میز کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھی تھی۔ سر جھکائے وہ اپنے کام میں منہمک تھی۔ کھلی کھڑکی سے سرد ہوائیں کمرے میں داخل ہو رہی تھیں جنہوں نے اس کے سر پر لی گئی سیاہ پشمینہ کی شال کو سرکا ڈالا تھا۔ اس کے کندھوں تک آتے چھوٹے بال اب ہوا کے دوش پر ہلنے لگے تھے۔ لیکن وہ اس سب سے بے نیاز اپنے ہاتھ میں پکڑے لکڑی کے ترچھی طرز پر کٹ شدہ قلم سے ایک بڑے سے بھورے کپڑے پر کچھ تحریر لکھ رہی تھی۔ وہ اردو تحریر تھی۔ سیاہی میں ڈوبے اردو کے ہجے۔

ان کی محفل میں نصیر ان کے تبسم کی قسم
دیکھتے رہ گئے ہم ہاتھ سے جانا دل کا

وہ در حقیقت کیلیگرافی (Calligraphy) کر رہی تھی۔اردو الفاظ کی کیلیگرافی کرنا اس کا پرانا اور بچپن کا مشغلہ تھا۔اس کی ماں کو اس کا یوں کاغذوں پر الفاظ لکھ کر وقت کا ضیاع کرنا سخت ناپسند تھا لیکن اس کی یہ بہت عزیز عادت تھی۔وہ یہ کر کے خوشی محسوس کرتی تھی۔اب اس کی سخت گیرامی کو یہ کون سمجھائے؟

اس نے قلم کو میز کی ایک جانب رکھی سیاہی میں ڈبویا اور دوبارہ کپڑے پر رکھ کر لکھنے لگی۔ وہ نہایت مہارت سے اپنا کام کر رہی تھی۔ انگلیوں کو مختلف زاویوں میں آہستگی سے گھما کر یوں لکھ رہی تھی کہ کپڑے پر نظر آنے والی تحریر کو چار چاند لگ گئے تھے۔ دفعتاً اس کے ہونٹ ہلے اور اس نے مدھم آواز میں غزل کا اگلا مصرعہ دہرایا۔ یہ اس کے پسندیدہ مصرعوں میں سے ایک تھا۔ اس کی آواز بہت پیاری تھی۔

نا سنا اس نے توجہ سے ، فسانہ دل کا

زندگی گزری مگر درد نہ جانا دل کا

"تو غمِ دل کو غزل کے الفاظ کے ساتھ غلط کیا جا رہا ہے۔" وہ آہستہ سی آواز میں مصرعہ دہرا رہی تھی جب اس کے کمرے میں غزل کے علاوہ ایک اور آواز گونجی۔ اس کے ہاتھ تھمے، آنکھیں اٹھیں اور اس نے مڑ کر آنے والے کو دیکھا۔ دروازے کے فریم میں کھڑی وہ اس کی بڑی بہن بریحنہ تھی جو اس کو تیکھے تیوروں کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ اس نے اس کو دیکھ کر ایک گہری سانس لی اور واپس اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اب یوں ہو گا کہ وہ بولے گی اور وہ سنے گی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی ہٹ دھرمی کی بدولت اسے امی نے بلایا ہو گا۔

"آپ کب آئیں؟ بچے کدھر ہیں؟ انہیں ساتھ نہیں لائیں؟" وہ پر سکون انداز میں سوال کرتے ہوئے مقابل کو آگ لگا گئی۔ وہ غصے سے چلتے ہوئے اس کے میز تک آئی اور میز پر جھکے اس کے سر کو گھورا۔

"تم اتنی بے نیاز واقعی ہو یا بس میرے سامنے ناٹک کرتی ہو؟" وہ نا جانے کیوں اتنے غصے سے اس کو گھور رہی تھی۔

"ناٹک باز ہم سب ہیں آپا۔ جو کہتا ہے میں نہیں ہوں وہ جھوٹا ہے۔ اور بتایئے، میں نے کیا کیا ہے؟" وہ ابھی بھی اپنے کام میں منہمک رہی۔ اس کی آواز باریک سی تھی۔ ایسی نہیں جو کانوں میں چبھتی ہو، بلکہ ایسی جس کو گھنٹوں بیٹھ کر سنا جا سکے اور انسان کا دل نہ بھرے۔ وہ مدھم لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بولتی تھی۔ مگر کم بولتی تھی۔ اب وہ کپڑے کے ایک کونے کو دوسری طرف موڑے اس پر لکھنے لگی تھی۔

"اپنی شاعرانہ باتیں مجھے مت سناؤ سماہا! میں تمہاری چھوٹی بہن کی طرح تمہاری مداح نہیں ہوں۔" اس کا لہجہ زہر خند تھا۔

"میں سمجھ نہیں پا رہی آپ اتنا غصہ کس بات پر ہیں۔اپنے گھر سے آپ مجھ پر چیخنے آئی ہیں؟"

اس نے براہ راست اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کو کس بات کا غصہ ہے لیکن جب تک وہ منہ سے نہیں بولے گی تو وہ بھی خاموش رہے گی۔

"میں تم پر چیخوں گی اور بہت چیخوں گی۔ تم ہمیں دھوکہ دے کر جاؤ گی کہاں؟ خوار ہو گی تم سماہا! خوار ہو گی تم یہ سب کر کے۔" وہ اس کو دھمکی دینے لگی۔اس کی دھمکی پر سماہا نے اپنے کام کو چھوڑ کر ایک جھٹکے سے قلم کو کاغذ پر پٹخا تھا۔ کوئی اسے سکون سے کام کیوں نہیں کرنے دیتا؟

"بریخنہ آپا! مجھے کچھ بتاؤ گی؟ نہیں تو میں یہاں سے چلتی ہوں۔آپ اپنا چیخنا جاری رکھیں۔"

وہ اب کرسی سے اٹھی تھی۔

"تمہارے کارناموں کی خبریں مجھ تک پہنچی ہیں۔اس لیے تم سے سوال کرنے آئی ہوں۔"

وہ کھڑکی سے ٹیک لگاتے ہوئے اس کو دیکھ رہی تھی جو اب اپنی چیزیں سمیٹنے لگی تھی۔ یہاں وہ سکون سے کام نہیں کر سکتی تھی۔ سامان سمیٹتے ہوئے اس کے پتلے ہاتھوں کے کچھ کچھ حصوں پر بھی سیاہی لگی تھی۔

"میں اپنے فیصلے خود لے سکتی ہوں آپا۔ مجھے آپ کی یا کسی کی بھی انگلی پکڑ کر چلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی میں یہ کام بہت عرصہ پہلے چھوڑ چکی ہوں۔ میں عادی ہوں آپا۔" اس تمام عرصے میں اس نے یہ اتنا طویل جواب دیا تھا۔ وہ اپنی چیزوں کو سمیٹ کر جانے لگی تو پیچھے سے بریخنہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سماہا نے مڑ کر اس کو بے تاثر آنکھوں سے دیکھا۔

"تم نے وعدہ کیا تھا سماہا! تم یوں وعدے سے مکر نہیں سکتی۔" بریخنہ نے برہمی سے اس کو یاد دہانی کروائی۔ سماہا نے نرمی سے اپنا ہاتھ اس کی قید سے نکالا۔

"میری یادداشت میں ایسا کوئی لمحہ نہیں جب میں نے ایسا کوئی وعدہ کیا ہو جو میری جان پر گراں گزرے۔" وہ سرد انداز میں اس کو کہہ کر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر مڑ گئی۔ وہ یہ سب بہت مشکل سے کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ آئے گی، اس سے سوال کرے گی لیکن اس کو یہ سب سہنا ہی تھا۔ اب وقت آن پہنچا تھا۔ دوسری جانب بریخنہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔

"تمہیں اس سے طلاق لینی ہو گی سماہا! سالوں پہلے یہی طے ہوا تھا اور اب بھی ایسا ہی ہو گا۔" بریخنہ پیچھے سے چلائی تھی۔ اور وہ جو کمرے سے نکلنے لگی تھی اس کے الفاظ سن کر اسکے قدم ٹھہرے۔ دھڑکن ان جملوں پر لمحے کو تھمی تھی۔ یہ لفظ اس کی سماعت میں زہر بن کر اترے

تھے۔آنکھوں میں مانوس نمی کی لہر چمکی۔لیکن ان سب کے باوجود اس نے تحمل سے اپنی بڑی بہن کو جواب دیا۔

"آپا! طلاق کا لفظ اپنی زبان پر مت لاؤ۔کیونکہ میں طلاق لوں گی نہیں اور وہ۔۔۔۔" وہ رکی۔ اس کے گلے میں کچھ اٹکا۔آنسوؤں کا گولا شاید؟

"وہ طلاق دینے کے لئے یہاں موجود نہیں!" اس نے پلکیں جھپک کر نمکین پانی کو واپس دھکیلا اور کمرے سے نکل گئی۔مزید اس بارے میں بات کرتی تو شاید بھید کھل جاتا۔بریحنہ نفرت سے اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔اس کو منانا مشکل نہیں ناممکن لگ رہا تھا۔وہ کب اس معاملے میں اس قدر سنجیدہ ہو گئی؟

دیر کی چمکتی دوپہر کی روشنی سے منور کمرہ اس لڑکی کے جانے کے بعد اب بوجھل ہو گیا تھا۔ان روح شکن باتوں نے کمرے کی اندرونی دلکشی نوچ ڈالی تھی جہاں نصرت صاحب کی غزل ابھی بھی گونج رہی تھی۔کمرے سے باہر نکل کر سیڑھیوں کی طرف جاتی سماہا منیر نے نم آنکھوں کو پونچھتے ہوئے ہلکی سی آواز میں خود سے کہا۔

"آپا! ہم دونوں کے درمیان فراق تو ہو سکتا ہے لیکن۔۔۔۔طلاق نہیں!"

دل لگی دل کی لگی بن کے مٹا دیتی ہے
روگ دشمن کو بھی یا رب نا لگانا دل کا

اسلام آباد، پاکستان۔

اسلام آباد کی چمکتی صبح کی تروتازہ روشنی نے ماحول کو تازگی بخش دی تھی۔آسمان صاف ستھرا تھا۔اسلام آباد کا خوبصورت موسم اکتوبر کے مہینے میں رگ و جان میں اتر جاتا تھا۔ہلکی سرد ہوائیں مری سے ہوتے ہوئے اسلام آباد تک آتی تھیں جن کی بدولت گرمی میں خاطر خواہ کمی ہونے لگی تھی۔آسمان بھی اس تبدیلی پر خوش نظر آتا تھا۔

اسی نیلے کھلے آسمان کے نیچے یہ بنگلہ اپنے پورے قد سے کھڑا تھا جس کے باہر لگی نیم پلیٹ پر آر ایم ہاؤس لکھا تھا۔بنیادی طور پر شیشے کی کھڑکیوں سے بنا یہ آر ایم ہاؤس مغرور اور بارعب تھا۔جیسے اس گھر کے مکینوں کی شخصیت کا تاثر اس بنگلے نے جذب کر لیا ہو۔یہ بنگلہ ایستادہ تھا سیاہ اور سرمئی رنگوں کی دلکش آمیزش میں لپٹا ہوا، جیسے رات کی چادر پر چاندنی کی ہلکی جھلک۔اس کی دیواریں شیشے کی تھیں، اتنی شفاف کہ اندر کی خاموشی باہر کے منظر سے ہم

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

کلام لگتی تھی۔ ہر کھڑکی ایک آئینہ تھی، جو آسمان کے بدلتے رنگوں کو اپنے اندر جذب کرتی تھی۔ چھت کی کناروں پر سرمئی پتھر کی تراش، اور داخلی دروازے کے دونوں جانب سیاہ سنگِ مرمر کے ستون، بنگلے کو ایک شاہانہ وقار عطا کرتے تھے۔ اندر سے روشنی باہر جھانکتی تھی، جیسے کوئی راز پنہاں ہو جو صرف چاندنی راتوں میں ظاہر ہوتا ہو۔

اس بنگلے کی بالائی منزل پر نظر ڈالو تو گلاس وال سے اندر کا منظر واضح دکھائی دیتا تھا۔ جدید طرز کی ورزشی مشینوں سے لبریز یہ ایک جِم روم تھا۔ گلاس وال کے بلکل سامنے دو ٹریڈ مل پڑی تھیں جن پر دو وجود بھاگتے نظر آتے تھے۔ پسِ منظر میں زمین پر لکڑی کی فلورنگ اور سیلنگ دکھائی دیتی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ بڑے سے سٹینڈ پر الگ الگ وزن کے ڈمبلز پڑے تھے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ بیٹل روپس (Battle ropes) کو لگایا گیا تھا۔ سیلنگ کے ساتھ پنچنگ بیگ بھی لٹکا ہوا تھا۔ نیز اس کمرے میں ہر وہ چیز موجود تھی جو ورزش کے لئے کارآمد تھی۔ جن میں سے دو اس وقت ان دونوں کے زیرِ استعمال تھیں۔

"تم آج آفس آؤ گے؟" ٹریڈ مل پر بھاگتے ہوئے وہ گلاس وال سے باہر جاگتے شہر کو دیکھ رہا تھا۔ دوسری ٹریڈ مل پر بھاگتے ہوئے محب نے محض ایک گہری سانس لی۔

"نہیں! ایک ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔ آج نہیں آؤں گا۔" وہ بھاگنے کی وجہ سے ہانپ رہا تھا۔

"اور کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ ضروری کام کیا ہے؟" راحب اب شہرِ مصروف کو چھوڑے اس کو دیکھ رہا تھا۔

"نہیں فلحال نہیں بتا سکتا۔" بھاگنے کی وجہ سے بال اس کی پیشانی پر آ گرے تھے۔

"تم کیا کرتے پھر رہے ہو محب! کبھی آفس میں رات دیر تک رہتے ہو اور کبھی گھر میں سٹڈی کا دروازہ بند کئے گھنٹوں گزار دیتے ہو۔ تمہیں کیا لگتا ہے؟ مجھے تمہاری حرکتوں کے بارے میں نہیں پتا؟" وہ اب غصے سے استفسار کر رہا تھا۔

"آپکو علم ہو جائے گا بھائی! ابھی مت پوچھیئے۔" اس کی آخری بات کو مکمل طور پر اگنور کرتے ہوئے اس نے راحب کو ٹالنا چاہا۔ جبکہ اس کے جواب پر راحب طنزیہ مسکرایا تھا۔

"تو مطلب مسٹر محب ہر بار کی طرح مجھ سے کچھ چھپانا چاہتے ہیں۔" وہ طنز کر رہا تھا۔

"میں آپ سے کچھ نہیں چھپاتا بھائی۔ بس آپ کو بتانے میں کچھ وقت لیتا ہوں۔" وہ ٹریڈ مل کی سپیڈ کم کرتے ہوئے بولا۔ اسکا ٹریڈ مل ٹائم پورا ہو گیا تھا۔

"تاریخ گواہ ہے کہ تم نے جب بھی مجھے کوئی بات بتانے میں وقت لیا ہے تو کچھ ایسی بات نکلتی ہے جو میرے اعصاب کو متاثر کرتی ہے۔" اس نے آنکھیں چھوٹی کر کے اس کو دیکھا۔ مسٹر راحب دنیا کے سامنے جتنے بھی خول چڑھالیں اپنے بھائی کے سامنے وہ تمام اتر جاتے تھے۔ کچھ لوگوں کے سامنے آپ ہمیشہ unfiltered ہی رہنا چاہتے ہیں۔ کوئی ایسا جس کے سامنے آپ کچھ بولنے سے پہلے سوچنا نہ چاہیں۔ جن کے سامنے آپ کھل کر ہنس سکیں۔ جو آپ کو آپ کی پرانی سے پرانی عادات پر بھی جج نہ کرے۔ راحب کے لئے وہ محب تھا کیونکہ وہ فیملی تھا۔ محب حسین وہ تھا جس کو راحب حسین نے جوانی سے لے کر اب تک خود پالا تھا۔

ناولز کلب
Clubb of Quality Content

"تو پھر یہ جان لیں کہ اس بار ایسا کچھ نہیں ہو گا بھائی۔ آپ کے لئے اب مزید کوئی مشکل پیدا نہیں کروں گا۔" اس نے راحب کو یقین دہانی کروائی۔ جہاں محب کی ٹریڈ مل اب رک چکی تھی وہاں راحب نے مزید سپیڈ تیز کی تھی۔ اس کے اس عمل کو محب نے غور سے دیکھا تھا۔

"تمہاری پیدا کی گئی مشکلات بھی سر آنکھوں پر۔" اس نے نرم لہجے میں کہتے ہوئے اس کا دل ہلکا کیا۔ تیز بھاگنے کی وجہ سے اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ کنپٹی اور ماتھے پر پسینے کے قطرے

چمکنے لگے تھے۔ بھاگنے کی رفتار اب کافی زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ لیکن وہ اس سے بے نیاز پوری قوت سے بھاگ رہا تھا۔ اپنے اوپر پہلے وہ کب نرم تھا جو آج ہوتا۔

"سپیڈ کم کر لیں راحب بھائی۔ صبح صبح اتنی سختی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" محب اس کو دیکھ رہا تھا جس ٹریڈ مل پر بھاگنے کی رفتار نارمل نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کو کوئی بات پریشان کر رہی ہے۔ کیونکہ راحب کا جم ٹائم ختم ہو گیا تھا لیکن وہ ابھی بھی وہیں تھا۔ اور ایسا تب ہوتا تھا جب وہ ذہنی خلفشار کا شکار ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ بتائے گا نہیں لیکن وہ بھی اس کا بھائی تھا۔ اس کی عادات سے واقف تھا۔ اس نے تاسف زدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"بتا کیوں نہیں دیتے کہ کیا بات آپ کو پریشان کر رہی ہے؟" اس نے بلآخر اس سے سوال کر لیا۔

"کوئی بات نہیں ہے محب!" اس نے تیز تنفس کے ساتھ بہت پیار سے اس کا نام لیا تھا۔

"ہر بار کی طرح آپ اپنی پریشانی مجھ سے چھپا رہے ہیں اور مجھ سے شکوہ کرتے ہیں کہ میں آپ کو کچھ نہیں بتاتا۔" محب ٹریڈ مل سے اتر کر اب ڈمبلز پکڑ رہا تھا۔

"ہاں تو تم چھوٹے بھائی ہو میرے۔ میرا فرض ہے تمہارا ہر مسئلہ حل کرنا۔" وہ جتاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اور آپ کی پریشانیاں کون حل کرے گا؟ فرشتے؟" اس نے آنکھیں گھماتے ہوئے استہزایہ کہا۔

"ہاں اچھا آئیڈیا ہے۔ مجھے ان سے کانٹیکٹ کرنا چاہیئے۔" اس نے بات کو مزاق میں اڑایا۔ محب نے افسوس زدہ نظروں سے اس کو دیکھا اور اس کی طرف پشت کرلی۔ اب وہ اس سے رخ موڑے ایکسرسائز کر رہا تھا۔ پندرہ منٹ ان کے درمیان خاموشی چھائی رہی جب راحب بولا۔

"محب! بس کرو۔ چلو ناشتہ کرنے چلتے ہیں۔" وہ یکدم ٹریڈمل کو بند کرتے ہوئے اس پر سے اتر گیا۔ گہری سانسیں لیتے وہ اب اپنا تنفس برابر کر رہا تھا۔ بھاگنے کی وجہ سے سانس چڑھی ہوئی تھی۔ محب نے خاموشی سے ڈمبلز رکھ دیے۔ وہ واقف تھا کہ وہ اب بات بدلنا چاہ رہا تھا اس لئے اس کا دھیان ناشتے کی طرف لگا رہا تھا۔ محب نے بازو سینے پر باندھ کر اس کو گھورا۔

Clubb of Quality Content

"کیا ہوا؟ گھور کیوں رہے ہو؟" راحب نے پانی کی بوتل منہ سے لگا کر اس کو دیکھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے کہ میں آپ کے حربوں سے واقف نہیں ہوں؟ سب جانتا ہوں میں آپ کے طور طریقے۔ میں خود پتا لگا لوں گا۔" وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے دعویٰ کر رہا تھا۔ راحب نے اس کو جواب میں صرف مسکرا کر دیکھا۔

"آئی اپریشیٹ اٹ!" اس نے محض کندھے اچکائے۔

"دیکھتے ہیں کون پہلے ایک دوسرے کے راز کو جان پاتا ہے۔" وہ جم روم سے باہر نکلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ محب اس سے آگے تھا۔ اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"آپ چیلنج کر رہے ہیں؟" اس نے استفسار کیا۔

"ہاں!" راحب نے اقرار کیا۔

"Okay Then! Its Brother versus Brother."

محب نے منظوری دی۔

کچھ لمحوں بعد آر ایم ہاؤس کے لاؤنج سے ہوتے ہوئے ڈائینگ روم کا رخ کرو تو وہ دونوں کھانے کی میز پر بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ ان کے وجود پر اب جم کے کپڑے نہیں تھے۔

راحب نے سفید تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ ٹائی ندارد تھی۔اس کا سفید قیمتی کوٹ دوسری کرسی کی پشت پر رکھا تھا۔اور وہ سفید شرٹ کے بازو موڑے وہ خاموشی سے ناشتہ کر رہا تھا۔ محب نے ہلکی بھوری ہوڈی کے ساتھ کریم رنگ کی سویٹ پینٹ پہنی تھی۔ یہ اس کا پسندیدہ لباس تھا۔

ہوڈی اور سویٹ پینٹس۔ اور باخدا وہ ان میں بہت اچھا لگتا تھا۔ معصوم اور بے ضرر محب حسین۔

وہ بھی خاموشی سے سر جھکائے ناشتہ کر رہا تھا جب اس خاموشی کو راحب کی آواز نے توڑا۔

"میں گھر بدلنا چاہتا ہوں۔" اس نے سر اٹھاتے ہوئے متانت سے کہا۔ جبکہ اس کی بات پر کانٹا اور چھری تھامے محب کے ہاتھ تھمے۔ آنکھیں سپاٹ ہوئیں اور چہرے پر بہت کچھ در آیا۔اس نے کانٹا اور چھری واپس پلیٹ میں رکھ دئے اور بھینچی ہوئی مٹھیاں گود میں رکھ لیں ۔ سر اٹھا کر بولا تو بس یہی۔

"میں بھی۔" اس کی آواز کہیں دور سے آتی تھی جیسے اس کو یہ بولنے میں دقت ہوتی ہو۔

"میں نے دو تین گھر دیکھ رکھے ہیں۔ تم میرے ساتھ چلنا اور ان میں سے۔۔۔" اس کے الفاظ محب کی بات نے کاٹے۔

"آپ اپنی پسند سے کوئی بھی گھر منتخب کر لیں بھائی۔ مجھے کوئی ایشو نہیں ہو گا۔" وہ رومال سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ راحب نے اس کو غور سے دیکھا۔

"لیکن کم از کم میرے ساتھ چل کر دیکھ تو لو۔" وہ ابھی بھی بضد تھا۔ محب اپنی نشست سے اٹھا اور گھوم کر قدم قدم چلتے اس کی کرسی کی پشت پر آیا۔ جھک کر ہاتھ راحب کے کندھوں پر رکھے اور زور دیا۔

"آپ کی پسند سر آنکھوں پر۔" اس نے مسکراہٹ دبا کر کہا۔ وہ اس کے الفاظ اسی کو لوٹا رہا تھا۔ راحب نے مسکرا کر کندھے پر موجود اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تھپکا۔ محب نے ہاتھ اس کے کندھوں سے ہٹا لئے اور اس کے سامنے آیا۔ وہ خود کو کمپوز کر چکا تھا۔ راحب نے اس کے سامنے آنے پر اسے گھورا۔

"مجھ سے دو سال چھوٹے ہو تم، یاد رکھو۔" اس نے اس کو دھمکی دی۔

"ہاں تو بس دو تین سال ہی تو چھوٹا ہوں۔آپ تو مجھے دس سال چھوٹے بھائی کی طرح ٹریٹ کرتے

ہیں۔ہر وقت ابا بنے رہتے ہیں۔اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔" وہ جان بوجھ کر اس کو چھیڑ رہا تھا۔

"چھوٹے بہن بھائی ہمیشہ چھوٹے ہی رہتے ہیں۔زیادہ ہواؤں میں مت اڑو!" اس نے آنکھیں

گھماتے ہوئے کہا اور کرسی سے اٹھ گیا۔وہ اب اپنی شرٹ کے مڑے ہوئے بازو سیدھے کر رہا تھا۔پھر اس نے کرسی کی پشت سے کوٹ اٹھا کر اپنے بازو پر رکھا۔محب اس دوران اس کو مسکرا کر دیکھتا رہا۔

Clubb of Quality Content

"خبردار جو میرے ساتھ زبان چالاکی کی۔اور یہ مسکرانا بند کرو۔" اس نے چبا چبا کر کہا۔محب نے فوراً اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔اس کا بھائی اپنی اس ٹون میں واپس آچکا تھا۔

"اور میرا چیلنج یاد رکھنا۔لٹل برادر!" اس نے یاد دہانی کروائی۔

"میں نہیں بھولوں گا۔بگ برادر!" وہ بھی چیلنج پر مصر تھا۔

"ٹھیک ہے پھر۔دیکھتے ہیں جیت کس کی ہوتی ہے۔" راحب نے اس کا کندھا تھپکا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ڈائننگ روم سے نکل گیا۔محب نے خاموش آنکھوں سے اس کی پشت دیکھی۔کیا وہ جان پائے گا کہ محب اس مرتبہ اس سے کیا چھپا رہا ہے؟ شاید نہیں۔اس دفعہ یہ کام محنت طلب ہو گا۔

"میرا راز پانا اس مرتبہ آپ کے لئے مشکل ہو گا بھائی۔" اس نے آہستہ سے سرگوشی کی اور باہر نکل گیا۔اس کی پراسرار سرگوشی ڈائننگ روم میں گونجتی رہ گئی۔وہ سرگوشی ڈائننگ کی اونچی دیواروں نے بھی سنی۔لیکن اس بات کا اسے کوئی خوف نہیں تھا۔وہ دیواریں وفادار تھیں کسی کو کچھ علم نہیں ہونے دیں گی۔

رات کو اسلام آباد میں پھر سے بارش ہوئی تھی۔گرمیوں کا اختتام اور سردیوں کی آمد آمد تھی۔سال کا سب سے حسین موسم آنے کو تھا۔سڑکیں بارش کے بعد کے نتائج کی وجہ سے گیلی تھیں۔ہلکی ہلکی سرد ہوا کے حالے میں کچھ کچھ نمی تھی۔ایسے میں ہاسٹل کی عمارت کے

سامنے واقع پارک میں وہ ایک بنچ پر بیٹھی تھی۔ ہاتھ میں وہی کتاب پکڑ رکھی تھی جو وہ ایک ہفتے سے پڑھ رہی تھی۔

The Courage To Be Disliked

رات سے ہی اس کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ کالج میں سر درد کی دوا لینے اور اسائنمنٹ کچھ حد تک بنا لینے کے بعد وہ واپس ہاسٹل آ گئی تھی۔ پھر پورا دن اس کا سوتے ہوئے گزرا تھا۔ شام کو سات بجے آنکھ کھلی تو کچھ بھوک کا احساس ہوا۔ صد شکر کہ اس کے ہاسٹل کے میس کا کھانا اچھا تھا۔ ورنہ کھانے کی شوقین ماحور کا کیا بنتا یہ تو اللہ ہی جانتا تھا۔

کھانا کھا لینے کے بعد اس نے کئی گھنٹے سٹڈی ٹیبل کے سامنے بیٹھے پڑھتے ہوئے گزار دیے۔ گھڑی پر رات کا ایک بجا تو اس نے کتابیں بند کر دیں۔ سونے کی کوشش کی تو نیند نہیں آئی۔ اماں کو کال نہیں کر سکتی تھی کہ رات کا ایک بج رہا تھا۔ اس لئے اس کی ساری رات جاگتے ہی کٹ گئی۔ ایک تو بے وقت سو لینے سے اس کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ رات ساری آنکھوں میں کٹ جاتی تھی۔ اور پھر جیسے ہی فجر کی آذان اس کے کانوں میں پڑی، اس نے بستر چھوڑ دیا۔ اللہ کے سامنے حاضری دی اور اپنی کتاب اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ آسمان

ہلکی ہلکی نیلاہٹ سمیٹے ہوئے تھا۔اندھیرا ابھی مکمل طرح چھٹا نہیں تھا جب وہ ہاسٹل سے باہر نکلی۔یہ اسے دن کا سب سے خوبصورت وقت لگتا تھا۔جب آسمان اپنے اصل رنگ کو ڈھونڈ رہا ہوتا ہے اور مطلع بلکل صاف ہوتا ہے۔ہوائیں ہر نجاست سے پاک اور مہکتی ہوئی ہوتی ہیں۔بارش کی وجہ سے ماحول میں ٹھنڈک کا کثیر اثر موجود تھا۔اس فضا میں سانس لینے کا الگ ہی سکون تھا جو اس وقت اس کی رگ و جان میں اتر رہی تھی۔کوئی ہو گا ماحور آدم جیسا جو گرم بستر کو چھوڑے سرد ہواؤں کو سینے میں اتارنے کو اس وقت باہر نکلا ہو گا جب سورج بھی مکمل نکل کر باہر نہیں آیا تھا؟

اور اب وہ بنچ پر بیٹھی کتاب پڑھنے میں مصروف تھی۔ہر قسم کی شال اور گرم کپڑوں کے بغیر۔سرد اور ٹھٹھرنے پر مجبور کرتی ہوائیں اس کے جسم سے ٹکرا رہی تھیں لیکن وہ اس سب سے بے نیاز اپنی جون میں مگن تھی۔کتاب کے اوراق وقفے وقفے سے بدلتے رہے۔ہر شے سے بے تعلق ماحور آدم صبح کی مدھم سی روشنی میں لاپرواہ سی تھی جب اس کو اپنے پاؤں کے قریب ایک سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔اس نے جھٹ سے کتاب میں سے سر نکال کر نیچے دیکھا۔وہ کوئی سفید چیز تھی جو اس کے پاؤں کے قریب ہی تھی۔اس نے مزید جھک کر دیکھا

تو اسے تشویش نے آگھیرا۔وہ ایک سفید مخملی بالوں والا خرگوش تھا۔ مناسب جسامت والا ایک چھوٹا سا خرگوش۔لیکن تشویش ناک بات وہ خرگوش نہیں بلکہ اس کے وجود پر موجود وہ سرخ مائع تھا۔ سرخ خون جو اس کی بائیں ٹانگ کی جانب سے بہہ رہا تھا۔سبز گھاس بھی جگہ جگہ سے سرخ ہو گئی تھی۔ خرگوش کی آنکھیں بند تھیں لیکن وہ سانس لے رہا تھا۔اس نے بے چینی سے چہرہ گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔پارک میں اس وقت اس کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ مطلب یہ کسی کا پالتو نہیں تھا۔وہ کوئی بھٹکتا ہوا خرگوش تھا۔اس نے مایوسی سے اس زخمی خرگوش کی طرف دیکھا۔اس کے پاس کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی جس سے وہ اس خون کو بہنے سے روک سکتی جو تواتر بہہ رہا تھا۔وہ مدھم سی گھر گھر کی آوازیں نکال رہا تھا۔ اسے تکلیف ہو رہی تھی وہ جانتی تھی۔ معاً اس نے پیچھے بنچ پر رکھی کتاب کو اٹھا کر اس میں سے کچھ صفحے پھاڑے۔پھر اس نے ایک صفحے کو اس کی زخمی ٹانگ پر رکھا۔کاغذ فوراً خون سے تر ہو گیا۔پھر وہ لگاتار صفحات پھاڑ کر اس کے گھاؤ پر رکھتی گئی لیکن اس سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔خون کے بہنے کی رفتار اب کم ہو گئی تھی لیکن زخم سے ابھی بھی خون رس رہا تھا۔اسے کوئی کپڑا چاہیئے تھا جس سے وہ اس کی ٹانگ کو لپیٹ سکتی۔اس نے سر پر موجود

دوپٹہ کی طرف ہاتھ بڑھایا تاکہ اس کے ایک حصے کو چاک کر کے اس کے زخم کو ڈھانپ سکے۔ابھی وہ دوپٹہ اتارتی جب اس کو ایک آواز سنائی دی۔

"اپنا دوپٹہ مت خراب کریں۔یہ لے لیں۔" ایک مانوس آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔اس نے سراسیمگی سے مڑ کر دیکھا تو چہرہ بھی مانوس تھا۔اس کی نظر نوارد کے چہرے سے ہوتی ہوئی ہاتھ میں پکڑے رومال تک آئی۔ ڈیجیٹل ایپل واچ پہنے ہوئے اس کے ہاتھ میں سیاہ رومال تھا جو وہ اس کی طرف بڑھائے ہوئے تھا۔ماحور نے دوبارہ آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

ناولز کلب
Clubb of Quality Content

ففتھ ایئر کا صالح خان اس کے سامنے تھا۔

جب وہ کچھ نہ بولی تو وہ بنچ کے پیچھے سے نکل کر اس کے سامنے آیا۔پھر ماحور نے اس کو جھکتے دیکھا۔

وہ دوزانوں بیٹھے خرگوش کی ٹانگ کا معائنہ کر رہا تھا۔اس کے سیاہ بالوں میں سے کچھ ماتھے پر چپکے تھے۔وہ شائد جاگنگ کر کے آیا تھا۔سفید ٹریک سوٹ پہنے وہ نہایت توجہ سے خرگوش کی ٹانگ پر رومال باندھ رہا تھا۔ماحور کو احساس نہیں ہوا کہ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ کہاں سے ملا آپ کو؟" اس کی آواز پہ اس کا ارتکاز ٹوٹا۔ اس نے فوراً اس کے چہرے سے نظر ہٹا کر خرگوش کو دیکھا جس کی ٹانگ پر اب رومال بندھا ہوا تھا۔

"یہ اس بنچ کے نیچے ہی تھا جب مجھے ملا۔" اس نے خود کو کمپوز کر کے جواب دیا۔ نامحسوس انداز میں اس نے اپنا دوپٹہ ٹھیک کیا اور خرگوش کو ہاتھوں میں اٹھائے کھڑی ہو گئی۔ صالح بھی اس کی تقلید میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے خاموشی سے سر جھکائے کھڑی لڑکی کو دیکھا۔ کیا اتفاق تھا۔ اتنے دنوں سے جہاں بھی وہ جاتا تھا یہ لڑکی وہاں پہلے سے ہی موجود ہوتی تھی۔ اور وہ کسی نہ کسی طرح اس کی مدد کر بیٹھتا تھا۔

"شکریہ۔" صالح کو اس کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ وہ اب سر اٹھائے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"کس لئے؟" اس نے استفسار کیا۔

"اس کے لئے بھی اور۔۔" وہ اٹکی اور آنکھیں پھر جھکا لیں۔ ایک تو پتا نہیں اس انسان کے سامنے آتے ہی اس کے الفاظ کہاں غائب ہو جاتے تھے۔ صالح نے سینے پر ہاتھ باندھ کر اسے دیکھا۔

"اور۔۔؟" اس نے اسے جملہ مکمل کرنے کو کہا۔ماحور نے پھر سے آنکھیں اٹھائیں۔صالح نے آنکھوں کی اس جھجک کو باآسانی محسوس کیا۔

"اور مسیحائی کے لئے بھی۔" اس نے صالح کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ خرگوش اس کے ہاتھوں میں اب آنکھیں موندے پڑا تھا۔صالح ہلکا سا مسکرایا۔وہ دوا دینے کی طرف اشارا کر رہی تھی۔

"آپ اور میں،دونوں ڈاکٹر بن رہے ہیں۔کوئی تکلیف میں ہو تو مسیحائی اولین فرض ہوتا ہے ہم ڈاکٹرز کا۔اور فرائض تشکر کے محتاج نہیں ہوتے۔" اس نے نرمی سے اس کا شکریہ رد کیا۔

Clubb of Quality Content

"فرائض تشکر کے نہیں تحسین کے محتاج ہوتے ہیں۔" اس نے بھی ملائمت سے اس کا نظریہ بدلنا چاہا۔

"اور تحسین غرور کے دروازے تک لے جاتی ہے۔" اس کا جواب دوبدو تھا۔

"انہیں کو لے کر جاتی ہے جو غرور کی تلاش میں ہوتے ہیں۔"

"کبھی کبھی بڑے بڑے پارسا بھی اس دروازے سے اندر جاتے دکھائی دیتے ہیں۔"

"یہ ایمان کا فرق ہوتا ہے۔قدر دانی اور ستائش میں فرق سمجھتے ہیں آپ؟ تحسین تکبر کے دروازے کی کنجی نہیں ہوتی۔یہ قدردانی کے سایہ دار درخت کی ٹھنڈی چھاؤں ہوتی ہے۔اس کے بغیر فرائض کے سورج کی تیز شعائیں جسم کو چیر ڈالتی ہیں۔" وہ اپنی بات پر ابھی بھی مصر تھی۔صالح نے مسرور ہو کر اسے دیکھا۔

"آپ اچھی باتیں کرتی ہیں۔" وہ واقعی متاثر ہوا تھا۔ماحور سر جھکا کر ہلکا سا مسکرائی۔

"اور آپ بحث اچھی کرتے ہیں۔" اس نے شرارت سے کہا تو صالح یکدم حیرانی سے ہنسا۔یہ غیر متوقع تھا۔

"آپ اس وقت ادھر۔۔؟" وہ اس وقت اتنی صبح اس کی یہاں موجودگی پر حیران تھا۔

"میرا ہاسٹل وہ سامنے ہے۔" اس نے انگلی سے دور عمارت کی طرف اشارہ کیا جو اس کا ہاسٹل تھا۔

"مجھے اس وقت صبح ہونے سے پہلے پارک میں بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔" وہ جھینپ کر کہہ رہی تھی۔کچھ کچھ شرمندہ سی۔ظاہر ہے یہ ایک عجیب عادت تھی۔صالح نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

"آپ کی اسائنمنٹ مکمل ہو گئی؟" وہ کیوں سوال پر سوال کر کے بات کو طول دے رہا تھا؟ یہ اسے خود بھی نہیں پتا تھا۔

"نہیں۔ ابھی بہت سے ٹاپکس رہتے ہیں۔" ابھی کل ہی تو اس پر کام شروع کیا تھا۔ اتنی جلدی

مکمل تو نہیں ہونی تھی۔ صالح نے دوبارہ سمجھتے سر ہلایا۔ بس اتنے سوال بہت تھے۔ اس نے اس کے بازوؤں میں بے سدھ خرگوش کو دیکھا۔

"یہ خرگوش مجھے دے دیں۔ آپ کا ابھی تھیوری پیریڈ چل رہا ہے۔ آپ نے ابھی کلینیکل ٹولز کو استعمال نہیں کیا ہو گا۔ میں اس کے زخم کو ٹھیک کر سکتا ہوں۔" اس نے اپنے بازو اس کی جانب بڑھائے تو ماحور نے خاموشی سے خرگوش اس کے حوالے کر دیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا ۔ وہ واقعی اس کے زخم کو نہیں ٹریٹ کر سکتی تھی۔

"یہ میرے پاس آپ کی امانت ہے۔" اس نے وعدہ کیا۔ ماحور نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ امانت کی حفاظت کرنے والا لگتا تھا۔ ہوتے ہیں کچھ لوگ جن کے پاس سے

ایک الگ قسم کی مثبت شعائیں آتی ہیں۔جو خیر سے بھرے ہوئے لگتے ہیں۔جن کے وجود کا ایک ایک حصہ بھلائی کی نشانی لگتا ہے۔ماحور کو اس وقت صالح سے وہی شعائیں آئی تھیں۔

خرگوش اس کے حوالے کر کے اس نے بنچ پر رکھی اپنی چاک شدہ کتاب کو اٹھایا اور ایک نظر اس کے بازوؤں میں موجود اس چھوٹی سی جان کو دیکھ کر مڑ گئی۔صالح خاموشی سے اس کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔چند قدم چلنے کے بعد اس نے ہلکا سا رخ موڑا اور اسے دیکھا۔سر پر دوپٹہ لئے، ہاتھوں میں کتاب پکڑے وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھی جب اس کی آواز سنائی دی۔

"شکراً۔" عربی میں پتا نہیں دوبارہ کس چیز کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔دوا کا؟ یا خرگوش؟ مگر صالح نے خاموشی سے سر کے خم سے بالآخر شکریہ قبول کر لیا۔ماحور واپس مڑ گئی اور صالح تب تک وہیں اپنی جگہ پر کھڑا رہا جب تک کہ وہ پارک کا گیٹ پار نہیں کر گئی۔پھر اسنے ہاتھوں میں موجود خرگوش کو دیکھا۔وہ بے سدھ اس کے بازوؤں میں پڑا تھا۔

"میں سمجھتا تھا کہ مجھ سا بھی کوئی عجیب ہو گا جو پو پھوٹنے سے پہلے جاگنگ پر آتا ہو گا۔جس کو نیلا چمکدار آسمان نہیں بلکہ سوتا ہوا فلک بھاتا ہو گا۔جو سرد یخ بستہ صبح کو دن کا بہترین وقت

سمجھے اپنے گھر سے محض اس لئے نکلتا ہو گا کہ خاموشی اس کی تلاش ہو گی۔آج میں اس شخص سے ملا ہوں سفید خرگوش سنو!" اس نے چہرہ سوئے ہوئے خرگوش کے پاس کیا۔" وہ شخص مجھے واقعی مجھ جیسا لگ رہا ہے۔" وہ مدھم سا بلکل آہستہ سے مسکرایا اور پلٹ گیا۔آسمان سیاہی سے اب نیلگی کی طرف واپس آرہا تھا۔روشنی اپنی تمام تر چمک لئے باہیں پھیلانے کو تیار تھی۔اپنا اصل رنگ اپنانے کو بے تاب یہ وسیع آسمان ان دونوں کی اس براہِ راست ملاقات کا واحد گواہ تھا۔

سورج کی تیز شعائیں سفیدی میں ڈھلی ہوئی خضر منزل پر بھی اتری تھیں۔بوگن ویلیا کی لمبی اور گلابی بیلیں روشنی سے چمک رہی تھیں۔خضر منزل اس وقت مسرت آمیز تھی کیونکہ رائنا وارث آج گھر پر ہی تھی۔بکھرے بالوں کا جوڑا بنائے وہ سیاہ کورڈ سیٹ پہنے کچن میں کھڑی تھی۔آنکھیں سرخ تھیں۔وہ ابھی سو کر اٹھی تھی اور اب اپنے لئے مارننگ کافی بنا رہی تھی۔ زری آپا بھی کچن میں ناشتا بنا رہی تھیں۔اس کی پشت کو دیکھ کر مسکرائیں۔

"صبح صبح آئسڈ کافی پینا نہایت خراب ہے صحت کے لئے۔ لیکن تم اپنی عادت نہیں چھوڑو گی۔" وہ تاسف سے سر ہلا رہی تھیں۔ رائنا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کی بات ہضم کی۔ اس کی آنکھیں تھکی تھکی سی تھیں۔ وہ رات بھر آر ایم آر کیٹیکٹس کے میٹینگ روم کا لے آؤٹ تیار کرتی رہی تھی۔ حالانکہ اس نے ابھی جگہ دیکھی نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ کچھ آئڈیاز اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتی تھی۔

"مجھے مت روکا کریں۔ صرف اس ایک معاملے میں میرا مجھ پر اختیار نہیں ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں آئسڈ کافی کے بغیر فنکشن کر سکتی ہوں۔" وہ آئس کیوبز اپنے کافی گلاس میں ڈال رہی تھی۔

Clubb of Quality Content

اکتوبر کا اختتام تھا لیکن مس رائنا کو برف کی جان نہیں چھوڑنی تھی۔

"تو کم از کم اس سے پہلے ناشتہ تو کر لیا کرو۔" زری آپا ابھی بھی اس کی کافی کے پیچھے پڑی تھیں۔

اس نے کافی مکمل بنا لینے کے بعد سٹرا سے ایک سپ لیا۔

اف! روح تک آگئی تاثیر مسیحائی کی۔

"آپ میری کافی کی جان چھوڑیں اور بتائیں ماما کی سالگرہ پر ان کے لئے کیا ناشتہ بنا رہی ہیں؟"

وہ ان کے پاس آکر بولی۔

"ان کو فرنچ ٹوسٹ پسند ہیں تو وہی بنا رہی ہوں۔ تم ان کو بلا لاؤ۔ میرا کام تقریباً مکمل ہو گیا ہے۔" وہ توس کو پلٹ رہی تھیں۔ رائنا نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا اور کچن سے نکل گئی۔ اب اس کا رخ ماما کا کمرہ تھا۔

رات کو بابا کی باتیں کرتے کرتے ماما اموشنل ہو گئی تھیں تو اس نے فوراً زری آپا سے کیک منگوایا تھا۔ ماما نے بھی فوراً آنسو صاف کرتے ان کے ساتھ خوشی سے کیک کاٹا تھا۔ پھر وہ ان کو اپنی نئی ڈیلینگ کے بارے میں بتانے لگی تھی۔ وہ اپنے سارے پراجیکٹ آکر ماما سے شیئر کرتی تھی۔ وہ اسے ہر چیز میں مشورے دیتیں کہ سیلنگ کو ایسے رکھا جائے، لائٹنگ ایسی ہونی چاہئے، کلر پیلٹ ایسے زیادہ اچھی لگے گی۔ وہ ان کے آئیڈیاز سے بہت مدد حاصل کر لیتی تھی۔ آر ایم آر کیٹیکٹس کے پراجیکٹ کو تفصیل سے ڈسکس کرنے کے بعد وہ انہیں شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ اور اب ان کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہی اس کے کانوں میں ماما کی آواز پڑی۔

"تو تم نہیں آؤ گے؟" وہ فون کان سے لگائے کال پر کسی سے بات کر رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے اندر داخل ہوئی اور چلتے ہوئے ان کے پلنگ تک پہنچی۔ منزہ بیگم اس کو دیکھ کر دوبارہ کال میں مصروف ہو گئیں۔ اس نے کمرے میں نظریں دوڑائیں تو اسے جلد ہی مطلوبہ چیز دکھائی دے گئی۔ سنگھار میز پر ریپنگ اترا ہوا ڈبہ دیکھا تو ہلکا سا مسکرائی۔ یعنی ماما اس کا تحفہ کھول چکی تھیں۔ وہ چل کر اس کے قریب آگئی اور ڈبے کو اٹھا کر کھولا۔ وہ نایاب پتھروں سے بنا ایک جیولری سیٹ تھا۔ پتلی سی وائٹ گولڈ کی باریک چین میں کچھ کچھ فاصلے پر مختلف پتھر جڑے تھے۔ کہیں زمرد، کہیں نیلم، کہیں لعل (Ruby)، کہیں فیروزہ تو کہیں یاقوت۔ مشترک رنگوں کے نئے نئے رنگوں والے پتھروں سے بنا یہ نیکلیس نہایت حسین تھا۔ سیٹ کے ساتھ کانوں میں پہنے جانے والے ٹوپس بھی تھے۔ سارے پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو قریب کر کے یوں جوڑا گیا تھا کہ ایک گلدستے کی شکل اختیار ہو گئی تھی۔ یہ جیولری سیٹ بلاشبہ شاہکار تھا۔ خوبصورت اور منفرد اشیاء کو اکٹھا کرنے کا شوق رکھنے والی رائنا وارث نے کیا خوبصورت تحفہ اپنی ماں کی نظر کیا تھا۔

"میں ایسی کون سی وجہ پیدا کروں کہ تم آجاؤ۔" اسے ماما کی آواز سنائی دی تو اس نے سیٹ واپس رکھ دیا۔ یہاں منزہ بیگم شاید مقابل کو آج قائل کر لینا چاہتی تھیں۔

"ادین بیٹے! اب تو اتنے سال گزر گئے ہیں۔" وہ کرب سے کال کی دوسری جانب شخص کو کہہ

رہی تھیں۔ رائنا نے خاموشی سے سیٹ کے ڈبے کو بند کیا اور چلتے ہوئے ان کے پاس پلنگ پر بیٹھ

گئی۔ ان کو دیکھا تو وہ افسردہ نظر آتی تھیں۔

"میرے لئے اس سے بڑا تحفہ کیا ہو گا کہ تم آجاؤ اور میری آنکھوں کے سامنے رہو۔" مقابل نے شاید تحفے کا سوال کیا تھا۔ رائنا ان کی باتوں کو خاموشی سے سنتی رہی۔

"مائیں سوال کرتی ہیں بیٹے۔ اولاد کے غموں کو سہنا ہم پر پہاڑ ٹوٹنے جیسا ہوتا ہے۔ تمہاری اولاد نہیں ہے نا، تم نہیں سمجھو گے۔" منزہ بیگم رنجیدہ تھیں۔ رائنا نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ کر دبایا۔ وہ گہری سانس لیتی رہ گئیں۔

"ٹھیک ہے، میں تمہیں فورس نہیں کرونگی۔ بلکہ میں کوئی ایسی وجہ پیدا کروں گی کہ تم وہاں

رک نہیں پاؤ گے۔" انہوں نے ایک عزم سے کہا۔دوسری طرف موجود ادین خضر مراد ان کی بات پر ہنسا تھا۔

"تم نے ہنسنا ہے تو ہنس لو لیکن میری بات یاد رکھنا۔" وہ اب خفا نظر آتی تھیں۔رائنا نے ان کو آہستہ آواز میں باہر ناشتے کے لئے آنے کو کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر پھر سے اس سے بات کرنے لگیں۔رائنا خاموشی سے ان کے کمرے سے باہر آگئی۔وہ جانتی تھی ابھی کچھ دیر بعد اس کا فون بجے گا۔ادین خضر مراد ماں سے بات کرنے کے بعد خاص طور پر بہن کو فون کرتا تھا۔وہ بے اختیار اداس ہوئی۔کتنے دنوں بعد آج وہ ادین سے بات کرے گی۔ورنہ وہ تو اتنی مصروف ہوتی تھی کہ کبھی کبھی رات کو گھر آتے ہی ماما سے ملے بغیر بستر پر ڈھیر ہو جاتی تھی۔ لیکن وہ شکوہ کنا نہیں تھی۔یہ روٹین اس نے خود کے لئے خود چنی تھی۔اس نے کاؤنٹر ٹیبل سے اپنا کافی کا گلاس اٹھایا اور زری آپا کو آواز دی۔

"زری آپا! زمل سکول سے آئے تو اسے میرے کمرے میں بھیج دیجئے گا۔ماما کے لئے تحفہ لینے گئی تھی تو اس کے لئے بھی کچھ چیزیں لائی تھی۔" وہ ان کو اطلاع کر کے اپنے کمرے میں آگئی۔ادین کی کال آتی ہی ہو گی۔

زمل زری آپا کی بیٹی تھی اور زری آپا منزہ بیگم کی ماموں زاد بہن کی بیٹی تھیں۔ منزہ بیگم اپنی ماموں زاد بہن صبوحی سے بہت پیار کرتی تھیں۔ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھیں کوئی بہن نہیں تھی اس لئے وہ اپنی ماموں زاد صبوحی کو ہی اپنی بہن مانتی تھیں۔ لیکن قسمت کے کھیل نرالے تھے۔ صبوحی نے اپنے مرنے سے ایک سال پہلے اپنی بیٹی زرینہ کی شادی بڑے دھوم دھام سے کی تھی۔ جب زرینہ آٹھ سال کی تھی تب ان کے والد کی وفات ہوئی۔ شوہر کی وفات کے بعد صبوحی نے زرینہ کو خود ہی پالا تھا۔ اس کے لئے وہ ایک سلائی سینٹر میں جاب کرتی تھیں۔ وقت گزرتا رہا اور صبوحی بیگم بوڑھی ہوتی گئیں۔ ہاتھوں میں طاقت اور جسم میں قوت کم ہونے لگی۔ زرینہ کے فرض سے سبکدوش ہونے کی فکر نے ان کو مزید ہلکان کر دیا تھا۔ وہ اس کو جلد از جلد اپنے گھر کا کرنا چاہتی تھیں۔ اسی سلسلے میں انہوں نے منزہ بیگم سے بات کی تھی۔ خضر کے مشورے کے پیشِ نظر انہوں نے دو تین لوگوں سے زرینہ کے لئے بات کی تھی اور اللہ کے کرم سے ایک خاندان کو زرینہ بہت پسند آئی تھی۔ صبوحی بیگم کی پریشانی ختم ہو گئی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کی

ساری جمع پونجی اپنی بیٹی کی شادی میں لگادی تھی۔اس بیٹی کی شادی میں جس کو محض ڈیڈھ سال بعد ہی سسرال سے ماں کے گھر واپس آنا پڑا۔

زرینہ کا شوہر حیدر ایک سیاسی پارٹی کا مرکزی ممبر تھا۔شہر سے باہر آنا جانا لگا رہتا تھا اور یہی اس کے لئے جان لیوہ ثابت ہوا تھا۔سیالکوٹ میں ہونے والے ایک سیاسی جلسے میں کسی بحث کی بدولت ہونے والی چپقلش کی وجہ سے پارٹی کے ممبران نے فائر کھول دئے تھے۔ان فائروں میں سے دو گولیاں زرینہ کے شوہر حیدر کو لگی تھیں جو جان لیوا ثابت ہوئی تھیں۔ صرف ڈیڈھ سالہ شادی شدہ زندگی گزارنے کے بعد زرینہ حیدر بیوہ اور چند ماہ پہلے پیدا ہونے والی زمل یتیم ہو گئی تھی۔صد شکر کہ یہ سب دیکھنے کے لئے صبوحی بیگم زندہ نہیں تھیں۔وہ اس دن کے وقوع پذیر ہونے کے چھ ماہ پہلے ہی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کر گئی تھیں۔زرینہ کا سسرال اپنی ذہنی پسماندگی کی بدولت زرینہ کو اپنے بیٹے کی موت کا سبب سمجھتا تھا۔انہوں نے اپنے بیٹے کی بیوہ کو منحوس قرار دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔یہ سوچے بغیر کہ وہ اس بھری دنیا میں بیٹی کے ساتھ کہاں بے سہارا گھومے گی۔لیکن اللہ اپنے بندے کو بے سہارا نہیں چھوڑتا۔

زرینہ چند ماہ کی ننھی منی زمل کو بازوؤں میں اٹھائے خضر ہاؤس آگئی تھی۔ خضر مراد نے نہایت پیار سے ان کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ یہ ایک باپ کا ہاتھ تھا۔ آج سے بیس سال پہلے یتیم ہونے والی زرینہ کو اس دن پھر سے باپ کا سایہ مل گیا تھا۔ اپنے بچپن میں یتیم ہو کر اکبر صاحب کے گھر آنے والے خضر مراد نے اس دن ایک یتیم بچی کو اپنے گھر میں جگہ دی تھی۔ وہ یتیمی کی اذیت سے واقف تھے اس لئے انہوں نے ایک یتیم کو تا عمر اذیت سے بچا لیا تھا۔ جب زرینہ اس گھر میں آئی تھی تب ادین بائیس سال کا اور رائنا چودہ سال کی تھی اور تب سے ہی زرینہ ان کی زری آپا بنی تھی۔ تب سے لے کر آج تک زرینہ عرف زری آپا ان کے ساتھ تھیں۔ سینتیس اڑتیس کی عمر کو چھوتی زری آپا اب ان کے گھر کا ایک فرد بن چکی تھیں۔ اور گزرے سالوں میں زمل حیدر دس سال کی ہو چکی تھی۔ اب سکول جانے لگی تھی۔ رائنا اور منزہ بیگم نے اس کو بہت سمجھدار بنایا تھا۔ اس کی ماں اموشنل تھی لیکن رائنا اس کو اموشنل نہیں ہونے دیتی تھی۔ وہ زمل حیدر کو آنسوؤں میں نہیں ڈبونا چاہتی تھی۔ وہ اس کو مضبوط بنانا چاہتی تھی اور کچھ حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گئی تھی۔

اپنے کمرے میں آنے کے بعد وہ آج شام کی میٹنگ کے کپڑے نکال رہی تھی جب اس کا فون تھر تھرایا۔اس نے واڈروب سے منہ نکال کر بیڈ پر رکھے فون کو دیکھا۔ادین کی ہی کال تھی۔کپڑوں کو چھوڑ کر اس نے فون اٹھایا۔

"تو تین ہفتے بعد کسی نے کال کر ہی لی۔"اس نے فون اٹھاتے ہی طنز کیا اور سکون سے بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھ گئی۔سٹرا سے آئسڈ کافی کا ایک گھونٹ لیا۔دوسری طرف ادین نے ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا۔

"ناراض تو نہیں ہو؟"اس نے اس کی ناراضگی کے خدشے کے پیش نظر پوچھا۔

"میں آپ سے ناراض نہیں ہو پاتی ادین۔"اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔وہ بھائی کہنے کی زحمت نہیں کرتی تھی۔ادین اس کے لئے صرف ادین ہی تھا۔

"ویسے بھی میں کیوں ناراض ہوں گی؟آپ بزی رہتے ہیں۔آپ کی جاب وقت مانگتی ہے۔"وہ اسے شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی اس لئے اس کو اپنے خفا نہ ہونے کی تسلی دی۔

"اچھا؟مان لیتا ہوں لیکن پھر نا کہنا کہ میں نے تمہیں ایک اور وجہ عناد دے ڈالی۔"ادین نے اسے باز رکھنا چاہا۔

"کیا مطلب؟" وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔ادین ایک گہری سانس لئے بولا تھا۔

"میں نے لایئر کو آج تم سے ملنے کو کہا ہے۔وہ شام میں آئے گا۔رائنا! بس ایک سائن کرنے ہیں۔پلیز ضد مت کرنا۔" وہ کسی خدشے کے پیشِ نظر کہہ رہا تھا۔لایئر کے بارے میں سن کر رائنا کی بھنویں کچھ تن گئیں۔ماتھے پر خفگی سے بل پڑے۔

"ادین! آپ اس بات کو بھول کیوں نہیں جاتے؟ میں نے آپ کو بہت پہلے یہ بات کلیئر کر دی تھی کہ۔۔۔" ادین نے اس کی بات کاٹی۔

"اور میں نے بہت پہلے تمہاری بات کو رد کر دیا تھا رائنا۔" اس نے اسکی یاد داشت پر دستک دی۔

"مجھے نہ کوئی پراپرٹی چاہیئے اور نہ ہی کوئی زمین۔وہ آپ کا حق ہے دین۔" وہ پیار سے اس کو دین بلاتی تھی۔

"تم مجھے اپنا بھائی نہیں مانتی تو صاف صاف کہو نا۔ایسے لفظوں میں لپیٹ کر کیوں بولنا؟" وہ تاسف سے کہہ رہا تھا۔رائنا نے اس کی بات پر حیرانی سے فون کان سے ہٹایا۔کیا کہہ رہے ہیں یہ؟

Clubb of Quality Content

"دین؟ میں نے ایسا کبھی نہیں کہا۔ آپ کیا کیا سوچتے رہتے ہیں؟" وہ حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔

"تم نے ابھی تو کہا کہ وہ آپ کا حق ہے۔ میرا حق ہوا تو تمہارا کیسے نہیں ہے؟ کیا ہم دونوں کو ایک ماں نے نہیں پالا؟ کیا ہم دونوں ایک ہی شخص کو بابا نہیں کہتے تھے؟ کیا دنیا تمہیں اور مجھے خضر کی اولاد کے حوالے سے نہیں جانتی؟ بتاؤ؟ پھر ہمارے حق جدا جدا کیسے ہوئے؟" وہ ہلکا سا بھڑک اٹھا تھا۔ رائنا نے ٹیک چھوڑ دی۔ وہ اب گلاس وال سے باہر چمکتے سورج کو دیکھ رہی تھی۔ حق جدا جدا نہیں تھے لیکن وہ اپنے دل کو کیسے سمجھاتی۔

"کیونکہ ہم دونوں کے نام کے ساتھ ایک ہی شخص کا نام نہیں لگتا ادین۔" اس کا لہجہ ہر تاثر سے پاک تھا۔ ایسے جیسے یہ بات اسکے لئے بہت عام ہو۔ وہ یہ کہنے کی عادی ہو۔

"آپ ادین ابنِ خضر مراد ہیں اور میں۔۔۔ میں رائنا بنتِ وارث حبیب! ہم دونوں کا نام ہی ہم دونوں کے حقوق کا تعین کیے دیتا ہے۔" اس کی آنکھیں خالی تھی۔ مگر ان میں ایک حسرت تیرتی دکھائی دیتی تھی۔ ایک ایسی بے نام خواہش جو کسی صورت پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ خضر مراد کی حقیقی بیٹی ہونے کی حسرت۔ ان کا خون ہونے کی حسرت۔ اس معاملے میں

تو وہ اور ادین جدا جدا تھے نا؟ دوسری طرف موجود ادین اس کی بات کو خاطر میں لائے بولا تھا۔

"ہمارے حقوق کا تعین بہت پہلے ہی ہو چکا ہے جب تم محض پانچ سال کی تھی۔ یہ پراپرٹی تمہارے نام کافی عرصے پہلے کی گئی تھی رائنا۔ مجھ پر بس بابا کی عائد کردہ ذمہ داری یہ ہے کہ اس پراپرٹی کو باحفاظت تمہارے حوالے کر دوں۔" وہ اب اس کو منانے کی کوشش کر رہا تھا جو آنکھیں زمین پر ٹکائے بیٹھی تھی۔ یہ بہت پرانا مسئلہ تھا جس کو حل کرنے کی کوشش کرتے کرتے ادین کو پانچ سال ہو گئے تھے۔ لیکن وہ تھی کہ اپنی ضد سے ہٹنے کو تیار ہی نہ تھی۔ وہ یہ پراپرٹی نہیں لینا چاہتی تھی جو خضر مراد اس کے نام کر کے گئے تھے۔ رائنا وارث خضر مراد کی پراپرٹی کی حقدار نہیں تھی۔ یہ صرف وہ کہتی تھی۔

"میرے نام جو پراپرٹی ہے آپ اس کو ماما کے نام کروا دیں۔ ماما ان کی وائف تھیں ادین۔ وہ لیگلی اس کی حقدار ہوئیں۔" وہ کچھ بھی کر کے اس کو حل ڈھونڈ کر دینے لگی۔

"رائنا! تم بچوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔ اگر ماما ان کی لیگلی ویڈڈ وائف تھیں تو تم ان کی لیگل چائلڈ ہو بے وقوف!" اس نے جھنجھلا کر کہا۔ ان پانچ سالوں میں وہ اسے لاتعداد بہانے بنا

کر دے چکی تھی لیکن حقیقت تو یہی تھی کہ وہ سب بے معنی تھے۔وہ چاہتی یا نہ چاہتی، یہ پراپرٹی تو اسی کی رہنی تھی۔لیکن ادین چاہتا تھا کہ وہ اسے اون کرے اور اس کو اپنے پاس حفاظت سے رکھے۔یہ ادین کی وہ ذمہ داری تھی جو خضر صاحب نے اسے دی تھی۔اور اب بہترین وقت تھا کہ وہ اسے نبھانا چاہتا تھا۔

خضر رائنا کو صرف اسکے باپ کے گھر سے اپنے گھر نہیں لائے تھے بلکہ تمام قانونی کارروائیاں مکمل کر کے اسے باقاعدہ گود لیا تھا۔وہ منزہ اکبر کی بیٹی تھی جس کو منزہ نے دس سال دعائیں مانگ مانگ کر حاصل کیا تھا۔اور منزہ اکبر وہ ہستی تھیں جن کو خضر نے دس سال کے طویل ہجرِ انتظار کے بعد پایا تھا۔انہیں منزہ کے ساتھ ساتھ منزہ کے وجود کا حصہ رائنا وارث بھی عزیز تھی۔عدالت نے خضر کو رائنا کا قانونی سرپرست قرار دے دیا تھا، اور یوں اس کی زندگی، تعلیم، علاج اور مستقبل سے متعلق ہر فیصلہ خضر کی ذمہ داری بن چکا تھا۔لیکن خضر نے اس معاملے میں ایک اور بات کا بھی خاص خیال رکھا تھا۔وہ جانتے تھے کہ اسلام میں کسی گود لی ہوئی اولاد کو باپ کے نام سے منسوب کرنا ہی جائز ہے۔قرآن میں صاف حکم ہے کہ:

"اُنہیں ان کے باپوں کے نام سے پکارو، یہی اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے"

(سورۃ الاحزاب 33:5)

اسی لیے، اگرچہ قانونی کاغذات میں وہ اس کے لیگل گارڈیئن تھے لیکن باپ کے نام کے خانے میں ہمیشہ رائنا کے نام کے ساتھ وارث کا نام موجود رہا تھا۔ یہ اس کی ذات کی حقیقت تھی اور انہوں نے اس سے یہ حقیقت نہیں چھینی تھی۔

رائنا کی طرف سے مسلسل خاموشی کو محسوس کر کے ادین نے فون کان سے ہٹا کر دیکھا۔ کال جاری تھی۔ وہ یکدم اداسی سے مسکرایا اور کہا۔

"تمہیں یاد ہے جب بابا تمہیں گھر لائے تھے اور پہلی بار اٹھایا تو انہوں نے کیا کہا تھا؟ تمہیں کیسے یاد ہو گا تم تو تب صرف ایک ماہ کی تھی۔ لیکن رائنا! میں آٹھ سال کا تھا۔ مجھے یاد ہے۔" وہ ماضی کو یاد کرتے کہہ رہا تھا۔ رائنا اس کی آواز سن کر متوجہ ہوئی۔

"انہوں نے کہا تھا کہ میں ایک آٹھ سالا بیٹے کا باپ ہوں لیکن یہ میری گود میں آئی ہے تو یوں محسوس ہوا ہے کہ جیسے میں آج ہی باپ بنا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ادین! تم آج سے میری اکلوتی اولاد نہیں رہے۔ میری بیٹی آ گئی ہے۔" خضر صاحب کے الفاظ بتاتے ہوئے اس کا لہجہ نہایت شیریں تھا۔

"مجھے اس دن سے لے کر آج تک کبھی نہیں لگا کہ تم خضر مراد کی اولاد نہیں ہو۔انہوں نے جب کہا کہ میری بیٹی آگئی ہے تو میں نے اپنی بہن کے وجود کو تسلیم کر لیا۔ان کی بات پر میں ایمان لے آیا۔" ان لفظوں پہ رائنا نے کرب سے آنکھیں بند کی تھیں۔ وہ اس سب کی حقدار کیسے نا ہوتی؟ وہ خضر مراد نے اپنی اکلوتی بیٹی کو ورثے میں دیا تھا۔

"کیا تم اب بھی انکاری ہو کاغذات کو سائن کرنے سے، رائنا وارث؟" ادین نے بالآخر حتمی انداز میں استفسار کیا۔آج تو اس معاملے کو انجام دے کر ہی وہ فون رکھے گا۔

"ادین مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔میں نے آپ سے۔۔۔"

"لائیر پیپرز دے تو اس پر خاموشی سے سائن کر دینا۔یہ تمہارے بڑے بھائی کا آرڈر ہے۔ڈو یو گیٹ دیٹ؟" وہ اس کے انکار کی گردان کو اگنور کئے بولا تو رائنا نے کراہ کر آنکھیں بند کیں۔اتنے سالوں کے انکار کے بعد اب اسے ہتھیار پھینکنے ہی پڑنے تھے۔اس لئے اس نے چار و ناچار رضامندی ظاہر کر ہی دی۔

"جی ادین!" اس کی آواز سنائی دی تو ادین نے شکر کی سانس لی۔آخر یہ محاذ حل ہو ہی گیا تھا۔ وہ جو اتنے سالوں سے مان کر نہیں دے رہی تھی آج مان گئی تھی۔

"تم بلوم انٹیریئرز کے آفس کی نئی برانچ کھولنا چاہتی تھی نا؟" اس نے نرم لہجے میں پوچھا جیسے بس تصدیق چاہتا ہو۔

"جی مگر آپ کو کیسے پتا؟" وہ لمحہ بھر کو حیران ہوئی۔ اس نے تو اس سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

"ماما مجھ سے ہر بات شیئر کرتی ہیں۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ رائنا نے اکتا کر آنکھیں گھمائیں۔ ایک تو ساری امائیں بیٹوں کی بہت سگی ہوتی ہیں۔ ہنہہ!

"آپ سے کچھ نہیں چھپا سکتیں وہ۔ جانتی ہوں میں۔" وہ چڑ گئی تھی۔

"تو تم چاہتی تھی کہ وہ مجھے نہ بتاتیں؟ مجھ سے چھپانا چاہتی تھیں تم؟" اس کی آواز میں سادگی چھلک رہی تھی جیسے وہ عام سا سوال کر رہا ہو۔ رائنا نے افسردگی سے آنکھیں جھکائیں۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ میں جانتی تھی کہ آپ کو بتاؤں گی تو آپ فائنانس کا پوچھیں گے۔ میرے پاس اچھے وسائل تھے لیکن پھر بھی آپ مجھے انہیں استعمال کرنے سے روک دیتے اور کہتے مجھ سے لے لو۔ میں ایسا نہیں چاہتی تھی۔" وہ بالکل نادم نہیں تھی لیکن ظاہر ایسا ہی کر رہی تھی۔ ادین نے تاسف زدہ انداز میں فون کان سے ہٹا کر دیکھا۔

"ہاں میں بالکل ایسا ہی کرتا کیونکہ تم میری چھوٹی بہن ہو۔ لیکن اب میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ تمہارے پاس تمہاری اپنی پراپرٹی ہو گی۔ تم جہاں چاہے، جیسے چاہے اپنی مرضی کی برانچ کھول سکتی ہو۔ میں تمہیں کیوں روکوں گا؟" اس نے خوشی سے اس کو حوصلہ دیا۔ رائنا بھی ہلکا سا مسکرائی۔

"جی! میرے پاس کچھ پراپرٹی تھی لیکن وہ ماما نے میرے نام کی تھی۔ میں اسے استعمال نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ وہ حقیقتاً اُن کا حق تھا۔ اب انہیں وہ واپس کر دوں گی۔" اس نے اپنے پلین سے ادین کو آگاہ کرنا چاہا۔

"رائنا! یہ پراپرٹی، زمینیں جائیداد انسان کی حفاظت اور بہتر مستقبل کی ضمانت نہیں ہوتیں۔ لیکن ان کا ہونا انسان کے مشکل وقت میں کہیں نا کہیں کام آجاتا ہے۔ تمہارے لئے بابا نے سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ لیا ہو گا نا۔ اس لئے بے فکر ہو کر جیسے دل چاہے اسے استعمال میں لانا۔" یہ اس کا حق تھا۔ وہ اسے جیسے مرضی استعمال کرتی وہ اس بارے میں جواب دہ نہیں تھی۔ ادین نے اس کو آج ہی یہ سمجھا دیا۔ رائنا نے اثبات میں سر ہلایا۔

"واپس کب آئیں گے آپ؟" یہ وہ سوال تھا جو وہ ہر کال کے آخر میں اس سے کرتی تھی۔

"جب اللہ نے چاہا۔" یہ وہ جواب تھا جو وہ ہر بار سوال کرنے پر اسے دیتا۔ وہ ہر بار اس کو مبہم جواب دیتا تھا۔ وہ بھی مزید سوال نہیں کرتی تھی۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کی انکی باتیں سمجھ آجاتی تھیں۔ وہ اگر بتاتا نہیں تھا تو وہ کریدتی نہیں تھی۔ البتہ منزہ بیگم اس سے بارہا یہ سوال کرتی تھیں اور وہ انہیں کیسے مناتا تھا یہ تو وہی جانتا تھا۔ اور اب تو منزہ بیگم اس کو بلانے کے لئے وجوہات ڈھونڈنے کی مہم پر لگ چکی تھیں۔ کیا معلوم وہ واقعی کوئی وجہ لے آئیں؟ کیا معلوم وہ واپس آجائے؟

ادین نے چند مزید باتیں کرنے کے بعد کال کاٹ دی تو وہ بھی اٹھ کر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ پہلے شام کے لئے کپڑے نکالے، بیگ اور ہیلز نکالیں۔ خود آشنا رائنا وارث اپنے اوپر مکمل وقت صرف کرتی تھی۔ یہ اس کی تھیراپی کا ایک حصہ تھا۔ جب سب تیاری ہو گئی تو وہ سائڈ ٹیبل کے پاس پڑے کچھ شاپنگ بیگز کو پکڑے کمرے سے نکل گئی۔ اس کی ادین سے بات کے دوارنیہ میں ہی گاڑی کا ہارن بجا تھا۔ زمل حیدر سکول سے آگئی تھی۔ اور اس کے تحفے اس کے منتظر تھے۔

آر ایم آر کیٹیکٹس میں معمول کی گہما گہمی تھی۔ہر کوئی آفس کے کسی کونے میں کھڑا اپنے اپنے طے شدہ کاموں میں مصروف تھا۔آر ایم آر کیٹیکٹس کی عمارت کے چوتھے فلور پر موجود راحب حسین کے آفس میں آئیں تو وہ فون کان سے لگائے ہوئے تھا۔

"مجھے جلد از جلد اس بارے میں خبر چاہیئے۔محب کہاں جاتا ہے؟کیا کر رہا ہے اور کس سے مل رہا ہے۔ایک ایک لمحہ تمہیں میرے گوش گزار کرنا ہے۔کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیئے۔"بولتے بولتے اپنے آفس ٹیبل پر ہاتھ مارتے ہوئے وہ کوئی چیز ڈھونڈ رہا تھا جو مل کر ہی نہیں دے رہی تھی۔

"تمہیں اس پر نظر نہیں رکھنی۔خبر دار جو اس کو تنگ کیا۔اسے اپنا کام کرنے دو اور تم اپنا کام کرو۔"اس نے ساتھ ساتھ تنبیہ کرنا ضروری سمجھا۔اسے صرف محب کی مصروفیات کا پتا لگانا تھا جو وہ اس سے چھپائے ہوئے تھا۔اس کے علاوہ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ایسا کیا کام ہے جو وہ راحب سے چھپانا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ وقت آنے پر بتاؤں گا۔

"ٹھیک ہے تمہارا کام ابھی سے شروع ہوتا ہے۔ خدا حافظ۔" معاً اس کے ہاتھ میں مطلوبہ چیز آئی تھی۔ وہ ایک ہلکے گلابی رنگ کا ویزیٹنگ کارڈ تھا جس پر بلوم انٹیریئرز کا لوگو آویزاں تھا۔ سی ای او کا نام بولڈ کر کے کارڈ پر لکھا تھا۔

رائنا وارث۔ سی ای او بلوم انٹیریئرز۔

اس نے غائب دماغی سے اس کارڈ کو دیکھا۔ یہ کارڈ اس کے پاس کل کی میٹنگ کے بعد نہیں آیا

تھا۔ یہ کارڈ اس کی آفس ٹیبل پر ایک مہینہ پہلے سے موجود تھا۔ اس نے دہرانا چاہا کہ یہ کارڈ اس کو

کہاں سے ملا تھا۔

یہ ایک ریستوران کا اوپننگ ایونٹ تھا جس کی آرکیٹیکچرل ڈیزائننگ آر ایم آرکیٹیکٹس نے کی تھی۔ اور اسی سلسلے میں وہ مہمانِ خصوصی کے طور پر آج یہاں موجود تھا۔ ریستوران کی تھیم سبز تھی۔ یہاں پیڑ پودوں کو زیادہ ہائیلایٹ کیا گیا تھا۔ ریستوران کے مالک کے ساتھ چند منٹ گفتگو کرنے کے بعد وہ ایک قدرے خاموش جگہ پر آ گیا تھا۔ یہ روف ٹاپ ایریا کی

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

بالکنی تھی جہاں وہ اس وقت کھڑا تھا۔ محب آج بھی اس کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ محب کو اصل میں گمنام رہنا پسند تھا۔ وہ کم گھلتا ملتا تھا اس لئے ایسی محفلوں میں آنا اس کے لئے ایک عذاب سے کم نہیں ہوتا تھا۔ لیکن پھر بھی راحب اس کو ایسے عذابوں میں عموماً ڈالے رکھتا تھا۔ بس آج اس کی جان خلاصی کر دی تھی۔

موسم ان دنوں گرم تھا جس کے بائث گرم ہوا اس کے وجود سے ہو کر گزر رہی تھی۔ اس نے بالکنی سے نیچے جھانکا۔ ہر طرف آتے جاتے لوگ اور بے حساب گفتگو۔ اس نے واپس آسمان کی طرف چہرہ اٹھایا اور چند گہری سانسیں لیں۔ اتنے دنوں سے وہ اس ریستوران کے پراجیکٹ میں مصروف رہا تھا۔ آج بالآخر وہ کچھ سانس لے سکتا تھا۔ وہ خاموشی سے آنکھیں موندے آسمان کی طرف سر اٹھائے کھڑا تھا جب اس نے کرسی گھسیٹنے کی آواز سنی۔ آواز پر اس نے آنکھیں کھولیں اور گردن موڑ کر ایک طرف دیکھا۔ روف ٹاپ کی بالکنی میں بھی ڈائننگ کے لئے کرسیاں اور میز لگائے گئے تھے۔ آواز بلکل بالکنی کی سرحدی ریل کے ساتھ رکھی میز سے آئی تھی۔ ایک لڑکی جس کی پشت اس کی طرف تھی وہاں سے عجلت میں اٹھ رہی تھی۔ اس نے فون کان سے لگا رکھا تھا۔ آواز وہ باآسانی سن سکتا تھا۔

"آپ کلینک سے نکلی تو نہیں ہیں نا؟ میں آ رہی ہوں آپ پلیز ابھی جایئے گا مت وہاں سے۔ پلیز ڈاکٹر طوبیٰ!" وہ عجلت میں میز سے اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے کسی کو نہایت بے بسی سے کہہ رہی تھی۔ لیپ ٹاپ، بیگ، گاڑی کی چابی اور ایک ہیئر کلپ۔ اس نے چیزیں جلدی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑیں اور تیزی سے وہاں سے نکل گئی۔ راحب نے محض اس کی پشت پر پھیلے ان سیاہ گھنگریالے بالوں کو دیکھا۔ وہ الگ تھے سب سے منفرد۔

وہ چلتا ہوا اسی میز کی طرف آیا جہاں سے وہ خاتون ابھی اٹھ کر گئی تھی۔ کرسی گھسیٹی اور ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میز پر آدھا کولڈ کافی کا گلاس ابھی بھی پڑا تھا جسے دیکھ کر اس نے ہنکارا بھرا۔ کالڈ کافی بھی کوئی پینے کی چیز تھی؟ اصل کافی گرم ہی ہوتی ہے۔ خیر!

گلاس سے ہوتے ہوئے اس کی نگاہ اس وزیٹنگ کارڈ پر پڑی جس پر بلوم انٹیریئرز درج تھا۔ اس نے فوراً اس کو اٹھا کر پڑھا۔ اپنے میٹنگ روم کے انٹیریئر کے لئے اسے جلد ہی کسی ڈیزائنیز کی ضرورت پڑنی تھی جس کی ابھی تعمیر جاری تھی۔ اس نے خاموشی سے وہ کارڈ اپنی سلیکس کی جیب میں ڈال دیا تھا۔

اور آج وہ کارڈ اس کے آفس میز پر پڑا تھا۔ کل جب اس نے بلوم انٹیریئرز کا نام سنا تو اسے وہ کارڈ یاد آیا تھا۔ اس پر بھی ایسا ہی نام درج تھا۔ مطلب وہ صحیح تھا۔ وہ وہی تھی سیاہ گھنگریالے بالوں والی جو اس دن فون پر تھی۔ اس کی یادداشت اچھی تھی اس لئے وہ اسے نہیں بھولا تھا۔

یکدم دروازہ ہلکا سا کھٹکا تھا۔

"سر! مس وارث آچکی ہیں کانٹریکٹ میٹنگ کے لئے۔" عمار دروازہ کھٹکھٹا کر اطلاع دے رہا تھا۔ اس نے جواب میں سر کو خم دیا تو وہ چلا گیا۔ راحب نے کارڈ واپس جیب میں رکھا اور اپنا فون اٹھا کر آفس سے نکل گیا۔

اس کے آفس کی دائیں جانب ہی چھوٹا سا میٹنگ روم تھا۔ وہ دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوا تو اسے وہ نظر آئی۔ بڑے سے شیشے کے میز پر وہ جھک کر اپنے لے آؤٹ چارٹس کو پھیلا رہی تھی۔

اس نے گہری نیلی لمبی ٹخنوں کو چھوتی قمیض زیب تن کر رکھی تھی۔ پیروں میں سیاہ سادہ ہیلز تھیں اور گھنگریالے بالوں کا آج جوڑا بنا ہوا تھا۔ دو آوارہ لٹیں گالوں پر بکھری تھیں۔ ہاتھ میں پنسل پکڑے وہ مکمل طور پر اپنے کام میں منہمک تھی۔

"گڈ ایوننگ!" اس کی آواز پر وہ سیدھی ہوئی۔ اسے دیکھا اور ایک کاروباری مسکراہٹ پاس کی۔

"گڈ ایوننگ مسٹر راحب!" وہ اب مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ تھی۔ راحب دو قدم چلتا ہوا اس کے آگے آیا۔ سفید سوٹ کا کوٹ غائب تھا اور آف وائٹ کرسپ شرٹ کے بازو فولڈ کر رکھے تھے۔ بال صبح سے شام ہونے تک کچھ بکھر گئے تھے۔ مگر آنکھیں ابھی بھی چمکدار تھیں۔ ہمیشہ کی طرح اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کرتی آنکھیں۔

"امید ہے آپ نے میٹنگ روم اور کیفیٹیریا کے ڈیزائننگ لے آؤٹ بنا لئے ہونگے۔" وہ میز پر پھیلے ہوئے چھ سات چارٹس کو دیکھ رہا تھا جس پر سیاہ پنسل سے مختلف نقشے بنے تھے۔ یہ وہ لے آؤٹ تھے جو اس نے تھری ڈی سافٹ ویئر سے اپنے کمپیوٹر پر تیار کئے تھے۔ کمپنی کو دکھانے کیلئے وہ ہمیشہ انہیں چارٹ پر سکیچ کر کے لاتی تھی۔

"یہ میری خود کی اور ابھی نامکمل تخلیقات ہیں۔ میں انہیں جگہ دیکھنے کے بعد ہی مکمل کر سکوں گی۔" اس نے جھک کر نامکمل لے آؤٹس میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا۔ چھ سے سات سکیچ شدہ چارٹس میں سے ہر ایک ابھی نامکمل تھا۔ کہیں کہیں فاصلے پر جگہ چھوڑی گئی

تھی تاکہ جگہ دیکھ لینے کے بعد اسے پر کیا جا سکے۔ راحب نے ایک نظر چارٹس پر ڈال کر اسے دیکھا۔

"چلیئے! میٹنگ روم کا ایریا دیکھ لیتے ہیں۔" اس نے اسے آگے چلنے کا اشارہ کیا تو رائنا ہاتھ میں ایک نوٹ پیڈ اور پین پکڑے اس کے ساتھ باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں عمارت کے چھٹے فلور پر موجود تھے۔ عمار ان سے پہلے ہی یہاں پر ہونے والی کنسٹرکشن کی نگرانی کر رہا تھا۔ اتنے وسیع فلور پر اس وقت ایک بڑی لیبر ٹیم کام کرنے میں لگی تھی۔ زمین ریت اور سیمنٹ سے لبریز تھی لیکن دیواریں مکمل گرے سٹرکچر کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ مشینوں کی آوازیں سارے ماحول میں گونج رہی تھیں۔ راحب اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اسے سارے فلور کے بارے میں معلومات دے رہا تھا۔ انہیں تھوڑی اونچی آواز میں بولنا پڑ رہا تھا۔

"مزید ایک ہفتے کا کام ہے اس کے بعد کنسٹرکشن ورک مکمل ہو جائے گا۔ پھر آپ انٹیریئر کے لئے مکمل طور پر آزاد ہوں گی۔ ابھی شاید آپ کو مشکل پیش ہو گی لیکن جلد ہی فلور خالی ہو جائے گا۔" وہ اس کی سہولت کے لئے جلد از جلد کام ختم کروانا چاہتا تھا۔

"نہیں مجھے کوئی مشکل نہیں ہو گی۔میں اس ماحول میں بھی با آسانی کام کر سکتی ہوں۔"وہ آہستہ آہستہ اپنے پیروں پر گھوم کر پورے فلور کا جائزہ لے رہی تھی۔ساتھ ساتھ وہ اپنے نوٹ پیڈ پر کچھ لکھ رہی تھی۔

"روم کا مین کلر سفید ہونا چاہیئے۔اس کے مطابق آپ ڈیزائننگ کر سکتی ہیں۔مجھے ایک لمبا درمیانی خلاء کے ساتھ اوشیپ کا سینٹر کانفرنس ٹیبل چاہیئے جو کہ فلور کے عین درمیان میں ہو۔"وہ میٹنگ روم کو لے کر اپنی ترجیحات بتا رہا تھا۔رائنا اس کی ترجیحات سنتی گئی۔کبھی وہ فرنیچر سے متعلق کچھ کہتا اور کبھی تھیم کے بارے میں۔چونکہ وہ پہلے ہی ایک آرکیٹیکچرل فرم کا پراجیکٹ تھا تو اسے کسی دوسرے آرکیٹیکٹ کو ہائر کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ورنہ پراجیکٹ سائن کرنے کے بعد اس کا پہلا کام یہی ہوتا تھا۔

"میڈیا وال میں پہلے ہی ڈیزائین کر چکی ہوں۔یہ میڈیا وال ہو گی۔"اس نے ایک لمبی اور چوڑی دیوار کی طرف اشارہ کیا جہاں ابھی کچھ لوگ سیمنٹ لگانے میں مگن تھے۔وہ اس دیوار کی طرف بڑھ گئی تو راحب اپنے سفید سلیکس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کے پیچھے چل پڑا۔وہ دیوار کے خشک سیمنٹ والے ایک حصے پر ہاتھ رکھ کر کچھ جائزہ لے رہی تھی۔راحب اس

کے پیچھے ایک قدم کے فاصلے پر آ کھڑا ہوا۔ وہ ہاتھ سے دیوار کو محسوس کر رہی تھی۔ سیمنٹ ابھی مکمل طور پر سوکھا نہیں تھا۔ کہیں کہیں ابھی بھی گیلا تھا۔

"ابھی یہ سیمنٹ گیلا ہے۔ اس پر کچھ بھی کام شروع نہیں کر سکتے۔ ہم ڈیزائینرز ہمیشہ سیلنگ سے سٹارٹ کرتے ہیں۔ اب بھی وہیں سے شروع کرینگے۔" وہ اپنے طریقہ کار سے آگاہ کر رہی تھی۔

"جیسے بھی آپ شروع کرنا چاہیں۔ عمار کو آپ اپنے ساتھ کہیں بھی لے جانا چاہیں تو لے جا سکتی ہیں۔"

"نہیں۔ پرچیزنگ کا کام میرا اسٹاف میرے ساتھ کروادے گا۔ آپ فکر مت کیجئے۔"

"لیکن سیلنگ سے لے کر فلورنگ تک کچھ۔۔۔۔" راحب کی بات بیچ میں ہی رک گئی جب رائنا نے اچانک ایک جھٹکے سے اسے مڑ کر دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ رائنا کے چہرے پر یکدم سختی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ پیچھے ہوتے ہوئے سیدھی ہوئی اور دبی دبی ناگواری سے اسے دیکھا۔

"دور ہو کر بات کریں۔"اس کا لہجہ سخت اور پختہ تھا۔راحب کو اس کی بات پر اسیس کرنے میں چند سیکنڈ لگے۔اس کی بات سمجھ آتے ہی راحب فوراً چار قدم پیچھے ہوا۔آنکھوں میں شرمندگی اور معازرت چھلکی۔

"آئم۔۔آئم سوری۔مجھے پتا نہیں چلا۔آئم ریئلی سوری۔"وہ نرمی سے معافی مانگ رہا تھا۔ رائنا نے رک کر کچھ گہرے سانس لئے۔آنکھیں کچھ دیر کیلئے بند کیں اور خاموشی سے وہاں سے آگے بڑھ گئی۔راحب نے کراہ کر آنکھیں موندیں۔اف! وہ سخت شرمندہ تھا۔

آدھے گھنٹے بعد پورے فلور کا ٹوئر کرنے کے بعد وہ واپس راحب کے عارضی میٹنگ روم میں موجود تھے۔میز پر اب رائنا کے چارٹس کے ساتھ ساتھ ایک کانٹریکٹ کا کاغذ بھی پڑا تھا۔وہ میز کی دائیں اور بائیں جانب موجود چیئرز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔عمار کانٹریکٹ رکھ کر جا چکا تھا۔راحب کے ہاتھ میں ہاٹ کافی کا مگ تھا اور رائنا کی ہاٹ کافی کا مگ انچھوا پڑا تھا۔وہ ایک ایک کر کے اپنے چارٹس فولڈ کر رہی تھی۔ڈیزائن فائنلائز ہو گئے تھے اب بس ان پر کام شروع کرنا تھا۔اوپر ہونے والی آخری بات کے علاوہ ان کے درمیان تب سے کوئی بات نہیں

ہوئی تھی۔ راحب کو ایک کال آگئی تو وہ اس میں مصروف ہو گیا اور رائنا فلور کا چکر لگاتی رہی۔اب وہ دونوں دوبارہ آمنے سامنے تھے۔راحب گلا کھنکار کر آگے کو ہوا۔

"کانٹریکٹ تیار ہے۔" وہ اس کے چہرے پر نظر جمائے بولا۔رائنا نے چارٹ کو واپس رکھتے ہوئے اسے سکون سے دیکھا۔راحب کافی کا سپ لیتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔رائنا نے ہاتھ سے کانٹریکٹ کو اپنی جانب کیا اور پین پکڑے اس پر سائن کر دیے۔راحب نے غیر محسوس انداز میں پہلو بدل کر ایک گہری سانس خارج کی۔

"یہ چارٹس میں یہیں چھوڑ کر جا رہی ہوں۔کل آکر انہیں مکمل کر لوں گی۔" اس نے تمام فولڈ شدہ چارٹس کو میز کے درمیان میں رکھ دیا۔

"یہ یہاں مکمل طور پر محفوظ ہیں۔" رائنا نے اس کی بات پر اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔راحب بھی اپنی چیئر گھسیٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"کل سے ہی میں اپنے سٹاف کو کام پر لگا دوں گی۔ وہ مجھ سے پہلے ہی یہاں پہنچ جائے گا۔" رائنا نے اپنا بیگ اٹھایا اور اسے الوداعی نظروں سے دیکھا۔وہ واقعی کافی پروفیشنل تھی۔ راحب ہاتھ پشت پر باندھے کھڑا تھا۔رات کے آٹھ بجے بھی وہ کہیں سے تھکا ہوا نہیں لگتا

تھا۔آنکھیں ویسے ہی چمک رہی تھیں جیسے دن بھر چمکتی رہی تھیں۔رائنا نے پہلی بار اس کی چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں دیکھیں۔یوں لگا کہ جیسے وہ ہر قسم کے شر سے پاک تھیں۔رائنا کے دل میں کچھ سکون اترا۔کیوں؟معلوم نہیں۔

"وی آر رئیلی گلیڈ ٹو ورک ود بلوم انٹیریئرز!ویلکم ٹو آر ایم آر کیٹیکٹس!"اس نے کھلے دل سے اسے خوش آمدید کہا۔رائنا نے مسکرا کر اس کا ویلکم قبول کیا۔اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی اور بولی۔

"اوکے دین مسٹر راحب!کل ملاقات ہوتی ہے۔گڈ نائیٹ!"وہ اسے الواع کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔اس کی ہیل کی ٹک ٹک قالین میں جزب ہو کر رہ گئی۔

راحب حسین بیگ واپس اپنی کرسی پر بیٹھا اور کافی کا مگ اٹھایا۔رائنا کا کافی کا مگ ویسے کا ویسا اپنی جگہ پر پڑا رہا۔وہ کالڈ کافی کی دیوانی تھی وہ کیوں ہاٹ کافی کو ہاتھ لگاتی؟راحب کو یاد آیا کہ وہ کالڈ کافی پیتی تھی۔اس نے گہری نظروں سے اس مگ کو دیکھا۔اس کی نظریں مگ پر لیکن دماغ کہیں اور تھا۔اس کا فون بج رہا تھا لیکن رنگ ٹون کی آواز اسے نہیں سنائی دے رہی تھی۔

وہ بے طرح کسی سوچ میں مگن تھا۔آخر ایسا کیا تھا جو راحب جیسے زیرک اور چوکنا بندے کے دماغ پر سوار تھا؟

اور پھر راز اپنے وقت پر ہی کھلتے اچھے لگتے ہیں۔

اسلام آباد کی مصروف شاہراہ کا منظر کچھ یوں تھا کہ آتی جاتی گاڑیاں ہواؤں سے باتیں کرتی جاتی تھیں۔ہر ایک شخص دوسرے سے پہلے نکل جانے کو پر تول رہا تھا۔زی روحِ اولادِ آدم زندگی کی دوڑ میں بھاگے چلے جا رہی تھی۔ایسے میں اس مرکزی شاہراہ کی دائیں جانب ایک مشہور کیفے میں گہما گہمی آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔رات ہو گئی تھی اور نو بجے لوگوں کا رش دن کے مقابلے میں کم ہونے لگا تھا۔کیفے کی دوسری منزل میں آؤ تو نظارہ مکمل طور پر بدل جاتا تھا۔نیچے موجود کرسیوں اور میزوں کے جیسا یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔بلکہ یہاں بڑے بڑے لکڑی کے ریک پڑے تھے جو لاتعداد کتابوں سے مزین تھے۔کہیں کہیں اکا دکا لوگ ریک کے پاس کوئی کتاب ہاتھ میں پکڑے کھڑے نظر آتے تھے۔کچھ لوگ گلاس وال کے ساتھ رکھی کرسیوں پر بیٹھے کتاب پڑھنے میں مصروف تھے۔حقیقتاً یہ صرف ایک کیفے نہیں بلکہ

لائبریری بھی تھی۔نچلا فلور کیفے کے لئے وقف کیا گیا تھا اور بالائی فلور کتابوں کے لئے۔گاہکوں کو کافی لے کر اوپر آجانے کی اجازت تھی۔کتنا حسین امتزاج تھا نا؟کافی کا مگ ہاتھ میں پکڑے اپنی پسندیدہ کتاب کا مطالعہ۔یہ کتابوں سے عشق کرنے والوں کی جنت تھی۔

ایسے ہی گلاس وال کے ساتھ رکھی کرسیوں میں سے ایک پر وہ بیٹھا تھا۔بھوری ہوڈی اور آف وائٹ سویٹ پینٹس والا محب حسین بیگ۔کتابوں کا دیوانہ۔سب کہتے تھے کہ جہاں محب ہوتا ہے وہاں کتابیں بھی لازمی ہوتی ہیں۔یہ سچ تھا کہ وہ اپنے ساتھ ہمیشہ ایک کتاب رکھتا تھا۔اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں انگریزی کی کوئی کتاب تھی۔کور پر لکھا نام فلحال چھپا ہوا تھا۔

وہ لائبریری کے ایک قدرے خاموش کونے میں سر جھکائے بیٹھا کتاب میں منہمک تھا۔دنیا و مافیا سے قطعی بے خبر۔ہر قاری کتاب پڑھتے وقت ایسے ہی دنیا سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔ہے نا؟

"لڑکے بھی کتابیں پڑھتے ہیں؟سٹرینج!"کتاب میں مکمل طور پر کھوئے ہوئے محب کے کان میں ایک باریک سی آواز گونجی۔اس نے آواز پر سر اٹھا کر دیکھا۔اس کے میز کے سامنے والی کرسی پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ سولہ سترہ سالہ ایک کالج گرل۔اس نے جینز اور سفید ہوڈی پہن رکھی تھی۔ سر پر چشمہ ٹکا ہوا تھا۔محب نے خاموش نگاہوں سے اسے دیکھا۔جیسے اس لایعنی تبصرے کی وجہ پوچھ رہا ہو۔اس نے ایک نظر اپنی کتاب کو دیکھا اور پھر اسے۔یہ صاف اشارہ تھا کہ وہ اسے کتاب پڑھتے وقت ڈسٹرب کر رہی ہے۔لیکن وہ بھی ڈھیٹ تھی۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم یہاں پچھلے تین گھنٹوں سے ہاتھ میں کتاب تھامے بیٹھے ہو۔اور اس لائبریری میں اس وقت تمہارے سوا کوئی لڑکا نہیں ہے۔" وہ خاصی کانفیڈنٹ تھی۔ایک اجنبی سے یوں باتیں کر رہی تھی جیسے میلے میں بچھڑ جانے والی سہیلی مل گئی ہو۔محب نے کتاب بند کی اور سہولت سے اسے دیکھا۔وہ ایک کہنی میز پر ٹکائے اس پر تھوڑی گرائے اسے دیکھ رہی تھی۔

"سنو لڑکی! ہاں میں لڑکا ہوں اور میں کتابیں پڑھتا ہوں اور کتاب پڑھنے کے دوران مجھے ڈسٹرب کرنے والوں کو میں معاف نہیں کرتا۔"اس نے ضبط کردہ لہجے میں کہا تو سامنے بیٹھی لڑکی نے بے پرواہی سے ہاتھ جھلایا۔

"ارے تم تو غصہ ہی ہو گئے۔میں بھی کتابیں پڑھتی ہوں۔دیکھو۔"اس نے ہاتھ میں پکڑی کتاب کو اوپر کر کے دکھایا۔وہ بھی انگریزی کی کتاب تھی۔

دی ہاؤس میڈ بائے فریڈا مکفیڈن۔

"دراصل میں بھی تب سے ادھر بیٹھی ہوں جب سے تم ادھر خاموشی سے بیٹھے کتاب میں مصروف ہو۔لیکن بات یہ ہے کہ میں اپنی کتاب مکمل کر چکی ہوں۔اب اس کو ہضم کرنے کے لئے مجھے کچھ وقت درکار ہے۔سوچا اتنی دیر تم سے باتیں کر لوں۔"وہ آنکھیں پٹپٹا کر کہہ رہی تھی۔محب نے اس کو بے زاری سے دیکھا۔

"سوری! تمہارا دل بہلانے کے لئے میں اویل ایبل نہیں ہوں لٹل گرل۔"اس نے بے رخی سے کہہ کر سر کتاب پر جھکا دیا۔لڑکی نے بے چینی سے لب کاٹتے ہوئے پھر اسے دیکھا۔وہ تو اس کی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔اس نے ایک بار پھر کوشش کی۔

"اچھا یہ تو بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟ میرا نام مشائم ہے۔" جواب ندارد۔

"کونسی کتاب پڑھ رہے ہو۔" اس نے اچک کر دیکھنے کی کوشش کی۔ محب نے رخ موڑ کر کتاب کا کور چھپالیا۔ پوسیسو فار بکس یونو!

"تم اتنی دیر سے یہاں بغیر کچھ کھائے پیئے بیٹھے ہو۔ تمہیں بھوک نہیں لگی؟" صاف ظاہر تھا کہ وہ اس سے بات کرنا چاہ رہی ہے لیکن سامنے والا نہایت سخت واقع ہوا تھا۔

"تمہیں کتاب پڑھتے دیکھ کر میں کافی شوکڈ ہوئی۔ مجھے لگا تھا کہ کتابیں صرف لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ بیچاری لڑکیاں بدنام جو اتنی ہیں۔" اس وقت وہ لڑکی واقعی بے چاری لگ رہی تھی۔

"اچھا یہ تو بتاؤ تمہارا پسندیدہ یونرا کیا ہے؟" اور بس۔ یہ وہ سوال تھا جس پر کوئی بھی قاری خود کو بولنے سے روک نہیں پاتا تھا۔

"کرائم تھرلر! بلکہ مجھے روم کوم بھی بہت پسند ہے۔ اور شاعری بھی۔ اور فینٹسی بھی۔ بلکہ نہیں! یہ اتنا نہیں پسند۔ اس کے علاوہ مجھ۔۔۔" محب صاحب بولنا شروع ہوئے تو پھر رکے نہیں۔ جیسے ہی ادراک ہوا تو یکدم بولتے بولتے رکا اور اسے دیکھا۔ وہ ویسے ہی تھوڑی تلے

ہاتھ ٹکائے شرارت سے مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ محب نے لب بھینچے اور خاموشی سے رخ گلاس وال کی طرف موڑ دیا اور بولا۔

"میں تمہیں کیوں بتاؤں؟" وہ کتاب کے صفحے تیزی سے پلٹنے لگا۔ مشائم نے محظوظ ہو کر اسے دیکھا۔

"ویل! بتا تو تم چکے ہو۔" اس نے میز پر آگے ہو کر اس کے ہڈی میں چھپے بالوں کو دیکھا۔ وہ بکھرے سے تھے۔ محب نے سر اسر اس کی آواز کو اگنور کیا۔

"میرا فیورٹ یونراہارر فکشن ہے۔" اس نے محب کے علم میں اضافہ کیا۔

"اور میں بچپن سے کتابیں پڑھ رہی ہوں۔" اس نے رعب بھی ڈالا۔ محب نے ہلکا سا چہرہ اسکی جانب موڑے اس کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ سولہ سالہ لڑکی کا ابھی بھی بچپن ہی چل رہا تھا۔ مشائم نے اسکی نظروں کو قطعی اگنور کیا اور بولنا جاری رکھا۔

"میری مام کہتی ہیں کہ زیادہ کتابیں مت پڑھا کرو ورنہ پاگل ہو جاؤ گی۔ اب ان کو کون بتائے کہ اگر میں کتابیں پڑھنا چھوڑ دوں تو پھر میں واقعی پاگل ہو جاؤں گی۔" محب کو یقین ہو گیا کہ اسے بولنے کا بہت شوق تھا۔ اور اب وہ بول بول کر اس کا دماغ چاٹ رہی تھی۔

"ویسے تمہاری ریڈنگ سپیڈ بہت کم ہے۔ پچھلے تین گھنٹے سے یہاں یہ کتاب پکڑے بیٹھے ہو اور یہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔مجھے دیکھو تین گھنٹوں میں ایک کتاب مکمل پڑھ ڈالی۔" وہ مصنوعی کالر جھاڑے کہہ رہی تھی۔ محب حسین نے کراہ کر آنکھیں بند کیں اور کتاب کو ایک جھٹکے سے بند کر کے میز پر پٹخ کر کھڑا ہوا۔وہ اپنی جگہ سے ذرا برابر بھی نہیں ہلی۔

"میری بات کان کھول کر سنو۔اگلے آدھے منٹ میں تم مجھے اس کرسی پر بیٹھی دکھائی نہ دو۔ چلو! چلو بھاگو یہاں سے۔" اس نے چٹکی بجا کر اسے مہذب لفظوں میں یہاں سے غائب ہونے کو کہا۔ وہ اب ہر گز اس بچی سے تکلف نہیں برت پایا۔لیکن وہ ڈھیٹ تھی پس جم کر بیٹھی رہی۔

"تمہیں آواز آرہی ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟" محب نے اس کو گھورا جو کرسی پہ بازو سینے پر باندھے یوں بیٹھی تھی جیسے کسی نے گوند سے چپکایا ہو۔

"تم میرا صبر آزما رہی ہو۔ میں نے کہا تھا نا کہ میں کتاب پڑھنے کے دوران ڈسٹرب کرنے والے کو معاف نہیں کرتا۔ تمہیں مجھ سے ڈرنا چاہیئے۔" محب غرایا تھا۔ایک تو اسکی کتاب

میں سب سے اہم سین چل رہا تھا اور وہ آ کر اس کے سر پر سوار ہو گئی تھی۔اس کو سخت تپ چڑھ رہی تھی۔مشائم ہنوز تھوڑی اٹھائے اس کو دیکھ رہی تھی۔لیکن اب اسکی آنکھیں پہلے کی طرح شرارتی یا تنگ کرتی نہیں تھیں۔محب سمجھ گیا کہ وہ بھی اس کے ساتھ وہی کر رہی ہے جو کچھ دیر پہلے وہ کر رہا تھا۔یعنی اب اگنور ہونے کی باری اس کی تھی۔اس نے ایک گہری سانس لے کر خود کو پر سکون کیا۔

"کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ ؟ کیوں میرے پیچھے پڑی ہو؟ وقت دیکھو اور اپنی عمر دیکھو۔ رات کے نو بج رہے ہیں۔شریف گھرانوں کے بچے اس وقت سکون سے اپنے گھر بیٹھے ہوتے ہیں۔"اس نے اس کو شرمندہ کرنا چاہا جس کا اسے کوئی خاطر خوا اثر ہوتا نہیں دکھائی دیا۔

اس کی عمر کے بچے اس وقت اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے اور ایک وہ تھی جو یہاں سے جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔محب نے خاموشی سے ایک فیصلہ کیا اور میز سے اپنی کتاب اٹھائی۔

"تم یہاں سکون سے بیٹھو اور مجھے معاف کرو۔"اس نے سر جھکا کر اسے دیکھا جو اب اسے چھوڑ گلاس وال سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کے رویے میں پہلے کی نسبت کچھ تو مختلف تھا۔ محب اس کو اس کے حال پر چھوڑے مڑا ہی تھا جب اسنے کچھ الفاظ سنے۔

"کیا تم واقعی مجھے نہیں سننا چاہتے؟"اس کی آواز گیلی تھی۔ محب چلتے چلتے بے اختیار اپنے قدموں پر جم گیا۔

"میری بہن کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے۔"اس کے الفاظ اس کے کانوں میں صور بن کر گونجے۔ محب نے تیزی سے اس کو مڑ کر دیکھا۔ وہ سر اٹھائے اس کو ہی دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں اب شرارت مفقود تھی۔ بلکہ ان میں پانی تھا۔

"دو گھنٹے پہلے مجھے فون آیا کہ اس کا ہاٹ فیل ہوا ہے۔ وہ۔۔۔ وہ بیمار تھی۔"آنسو اسکی آنکھوں سے بہہ نکلنے کو تیار تھے لیکن وہ انہیں تھامے بیٹھی تھی۔ محب کے لب ہلکے سے واہ ہوئے۔ وہ یکدم ڈسٹرب نظر آنے لگا۔ آنکھوں میں ایک پرانا اور گہرا قلق جاگا۔

"اس کے دل کی حالت ہمیشہ سے نازک تھی۔ وہ دل میں سوراخ لے کر پیدا ہوئی تھی۔ لیکن اس کا علاج ہو گیا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک ہو گئی تھی۔ لیکن پتا نہیں ایسا کیا ہوا کہ اس کی صحت

دن بدن گرتی گئی۔"اس کی آنکھوں کی شکستگی کے برعکس اسکی آواز مضبوط تھی۔یا کم از کم وہ بنائے ہوئے تھی۔

"اور آج جب میں صبح اس کو ہنستے دیکھ کر کالج گئی تھی تو میں بہت خوش تھی کہ میری بہن ٹھیک ہو رہی ہے۔"وہ نم آنکھوں سے مسکرائی۔محب خاموشی سے اسکو سنے گیا۔اسے لگا کہ اگر وہ اس اداس لڑکی کا سامع نہ بنا تو وہ شاید پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔

"لیکن اب مجھے فون آیا ہے کہ وہ۔۔۔وہ جا چکی ہے۔میری بڑی بہن جا چکی ہے۔"وہ یکدم میز پر سر ٹکائے رونے لگی۔محب سرعت سے اس کی جانب بڑھا اور اسکا جھکا سر دیکھا۔اسکا وجود سسکیاں بھر رہا تھا۔

"وہ میری بڑی بہن تھی۔اسے آخر تک میرے ساتھ رہنا چاہیئے تھا لیکن وہ چلی گئی۔"وہ ہچکیاں بھر رہی تھی۔محب نے پلکیں جھپکیں۔نمی اس کی آنکھوں میں بڑھنے لگی تھی۔بصارت دھندلی ہونے لگی۔وہ جو اتنی دیر سے اپنی بے تکی باتوں سے اس کو تنگ کیے جا رہی تھی وہ دراصل اس کے اندر موجود غبار تھا جسے وہ چھپائے بیٹھی تھی۔

"تم نے کہا کہ شریف گھرانے کی لڑکی اتنی رات تک باہر نہیں رہتی لیکن میں کیا کروں مجھے خوف آتا ہے۔مجھے ڈر لگتا ہے کہ میں کیسے اس کو کفن میں لپٹے دیکھ سکوں گی جسے صبح ہنستے دیکھا تھا۔" وہ اپنی عمر سے بڑے جزبات رکھتی تھی۔اس نے سر اٹھایا تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھرا ہوا تھا۔

"میں تمہیں تنگ نہیں کر رہی تھی۔میں تو بس بھاگنا چاہتی تھی۔" وہ اب وضاحتیں دے رہی تھی۔محب نے نفی میں سر ہلایا اور کرسی پر بیٹھا۔

"میری بات سنو! تمہیں گھر جانا چاہیئے مشائم!" اس نے بہت مشکل سے الفاظ اکٹھا کئے۔ مشائم نے فوراً نفی میں سر ہلایا لیکن محب اپنی جیب سے فون نکال رہا تھا۔

"مجھے اپنے گھر کا نمبر دو۔میں انہیں انفارم کرتا ہوں کہ تم کہاں ہو۔وہ تمہارے لئے پریشان ہو رہے ہوں گے۔" وہ اس سے نمبر مانگ رہا تھا جبکہ مشائم مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ محب نے اسکو ترحم سے دیکھا۔

"تمہیں گھر جانا ہے مشائم۔تمہارے گھر والے تمہارے لئے کس قدر پریشان ہوں گے۔تم چاہتی ہو کہ انہیں ایک کے علاوہ دو دو بیٹیوں کا غم سہنا پڑے؟" اس نے یکدم پختہ لہجے میں

کہا تو مشائم تھم گئی۔آنسو رک گئے اور وہ حیرانگی سے اس شخص کا چہرا دیکھنے لگی جو سخت دکھتا تھا لیکن نہایت عاجز واقع ہوا تھا۔

"کیا تم چاہتی ہو کہ وہ تمہاری تلاش میں بھٹکتے پھریں جبکہ انکی بیٹی کی میت گھر پر پڑی ہو؟ کیا تم ایسا چاہو گی؟"مشائم روتے ہوئے سر نفی میں ہلاتی رہی۔لائبریری میں اب ان دونوں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔

"تمہیں مجھے ان کا نمبر دینا ہو گا تاکہ میں تمہیں باحفاظت انہیں سونپ سکوں۔"محب نے دہرایا تو وہ بلآخر آنسو صاف کیے اس کو نمبر بتانے لگی۔محب نے آنکھیں اٹھا کر اس کے ہچکولے کھاتے وجود کو دیکھا۔وہ معصوم کیا کچھ اپنے اندر چھپائے بیٹھی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد کیفے کے پارکنگ لاٹ میں وہ دونوں موجود تھے۔وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

بال اب کس کر جوڑے میں بندھے تھے اور آنکھیں ابھی بھی نم تھیں۔محب اس کا منہ دھلوا کر اسے یہاں لایا تھا۔اس کے والد کی گاڑی ان کے دائیں جانب کھڑی تھی۔جب محب نے انہیں کال کی تھی تو وہ نہایت پریشانی میں مشائم کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔محب کی کال سے

ان کی سانس میں سانس آئی تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے اس کی بھیجی ہوئی لوکیشن تک آئے تھے۔ محب سے ملے تو سیدھا بے اختیار گلے لگ کر اس کا شکریہ ادا کرتے رہے۔ محب نے بہت آرام سے ان کو حوصلہ دیا اور ان کی بیٹی کی تعزیت بھی کی۔ ان کو یہی بتایا تھا کہ مشائم اس کو روتے ہوئے ہی ملی تھی۔ اور اب وہ سر جھکائے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ آتے جاتے ہم کتنے لوگوں کو پاس سے گزرتے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے علاوہ سب خوش ہیں لیکن جو جنگیں وہ لڑ رہے ہوتے ہیں وہ ہم سے چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔ محب کو اس بات کا شدت سے احساس ہوا۔

"بھاگنا نہ کسی چیز کا حل ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ جو غم قدرت نے فیس کرنے کے لئے لکھا ہے وہ ہم فیس کیے بغیر اس دنیا سے جا نہیں سکتے۔" وہ جانے سے پہلے اس کو نصیحت کر رہا تھا جو سر جھکائے کھڑی تھی۔

"آئندہ کبھی بھاگنا چاہو تو مجھے فون کر دینا۔ تمہارا بڑا بھائی بن کر تمہیں حل نکال کر دوں گا۔" اس

نے اپنا کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔ مشائم نے خاموشی سے تھام لیا۔ وہ اب قبولیت کے فیز سے گزر رہی تھی۔ اس کا خاموش رہنا اس کے لئے ٹھیک تھا۔

"پوری لائبریری میں اتنے لوگ ہونے کے باوجود تم میرے ہی پاس کیوں آئی مشائم؟ کسی لڑکی کے پاس چلی جاتی۔ وہ تمہیں مجھ سے بہتر تسلی دے سکتی تھی۔" محب نے اس کو سر اٹھانے پر مجبور کیا۔ مشائم نے گیلی آنکھوں سے اس کو دیکھا۔

"میں نے تمہاری کتاب کے پہلے صفحے پر سیاہی سے لکھی سطر پڑھ لی تھی۔ تمہارے پاس آنے کی واحد وجہ بس یہی تھی۔" اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا اور مڑ گئی۔ اور محب؟

محب ششدر سا اس کی پشت دیکھتا رہ گیا۔ اس کو زلزلوں کی زد میں چھوڑے وہ اپنے گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ گاڑی میں بیٹھی، گاڑی کے انجن نے شور کیا اور گاڑی پارکنگ لاٹ سے نکل گئی لیکن محب وہیں کھڑا رہا۔ اس کے الفاظ اس کے دماغ میں گونجتے رہے۔

محب حسین کو پارکنگ لاٹ میں چھوڑے اوپر لائبریری میں آئیں تو میز پر کتاب ایسے ہی کھلی پڑی تھی۔ کسی کھلی کھڑکی سے آتی ہوا کے باعث کتاب کے صفحے باآواز پھڑ پھڑا رہے تھے۔

Clubb of Quality Content

یکدم شاید کسی نے کھڑکی بند کی تھی۔ پھڑپھڑاتے صفحے جامد ہوئےاور ایک جگہ رک گئے۔ کھلی ہوئی کتاب کا پہلا صفحہ سامنے تھا جس پر سیاہی میں ڈوبے الفاظ نظر آتے تھے۔

“In the remembrance of my deceased Sister.”

کسی تلوار کی تیز دھار، کسی محبوب کی بے رخی اور لہجوں کی کرختگی سے بھی زیادہ سرد ہوا کھلے آسمان کے نیچے بیٹھی اس لڑکی کے وجود سے آر پار ہو رہی تھی۔ جاڑے کی رات میں سیاہی کے چادر اوڑھے آسمان پورے جوبن پر پر پھیلائے ہوئے تھا۔ سیاہی نے ہر طرف ڈیرہ ڈالا تھا لیکن اس سب سے بلکل بے نیاز وہ ایک لکڑی کے تخت پر بیٹھی ہاتھ میں پکڑے پتلے سے قلم سے کاغذ پر الفاظ گھسیٹ رہی تھی۔ چھت پر ایک طرف سفید روشنی والا بلب جل رہا تھا جس کی روشنی اس تک بھی آتی تھی۔ وہ سر جھکائے آہستگی سے کچھ لکھ رہی تھی۔

نہیں نہیں! وہ کیلیگرافی نہیں کر رہی تھی۔ وہ اشعار بن رہی تھی۔

سماہا منیر بیگ ایک شاعرہ تھی۔ایک ایسی شاعرہ جو ہمیشہ سے گمنام تھی۔ناشناس اور غیر معروف۔

کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جو قدرت نے آپ کی شخصیت کے ساتھ باندھ دیے ہوتے ہیں۔ شاعری بھی اس کے لئے ایسا ہی کام تھی۔یہ اس کی ذات کا وہ امر تھا جو نا چاہتے ہوئے بھی سالوں پہلے عیاں ہو گیا تھا۔سالوں پہلے اس نے اپنا پہلا شعر لکھا تھا اور پھر سلسلہ بندھ گیا۔وہ کاغذ پر کاغذ بھرتی گئی اور جزبات دل سے نکل کر کاغذ پر نقش ہوتے گئے۔اس کی الماری کا ایک خانہ کاغذات کی نظر ہو گیا۔لیکن اس شاعری کا آغاز کب اور کیسے ہوا اس قصے کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔

ابھی منظر کا افسردہ وجود وہ خود تھی جو اپنے کام میں مگن تھی۔سیاہ رات میں سفید شلوار قمیض کے اوپر سفید ہی پشمینہ کی چال اوڑھ رکھی تھی۔کندھوں تک آتے بال فلحال چھپے ہوئے تھے۔تھوڑا آگے ہو کر اس کی گود میں رکھے کاغذ پر ڈالی جائے تو چار مصرعوں کا ایک شعر تمہارے سامنے تھا۔

وہ پناہیں جو میسر نہیں ہیں مجھے ابھی

Clubb of Quality Content

جو مل جائیں تو انہیں میں بسیرا کر لوں

وہ آئے تو سامنے بٹھاؤں اسے اور اسے دیکھتے دیکھتے ہی رات سے سویرا کرلوں

"سماہا چلو نیچے چلیں دیکھو کتنی رات ہو گئی ہے۔" کاغذ پر جھکی آنکھوں کا ارتکازِ تسلسل اس کی بہن کی آواز سے ٹوٹا تھا۔ اس نے چہرہ اٹھا کر پرنیہ کو دیکھا جو چھت کے دروازے پر کھڑی اسے بلا رہی تھی۔

"تم جاؤ میں آجاؤں گی۔" اس نے زکام زدہ آواز میں کہا۔ پرنیہ نے اسے افسوس سے دیکھا۔ دروازہ چھوڑے وہ چل کر اس کے ساتھ آکر تخت پر بیٹھ گئی۔ سماہا نے خاموشی سے اسکو جگہ دے دی۔

Clubb of Quality Content

"آج کچھ لکھا ہے؟" پرنیہ نے بشاشت سے پوچھا۔اسکی چھوٹی بہن پرنیہ اسکی سب سے مداح تھی۔ وہ کل پانچ بہنیں تھی۔اس سے بڑی دو تھیں اور اس سے چھوٹی بھی دو تھیں۔ وہ درمیان میں تھی۔پرنیہ کا نمبر اس کے بعد تھا اور سب سے زیادہ وہ پرنیہ کے ہی قریب تھی۔

"ہاں۔"اس نے کاغذ کو فولڈ کرنا شروع کیا۔وہ جانتی تھی کہ ابھی وہ یہ کاغذ نیچے جا کر اپنی شاعری سے بھرے ہوئے کاغذات والے خانے میں رکھے گی تو صبح تک پرنیہ اسے پڑھ چکی ہو گی۔گھر میں سب جانتے تھے کہ سماہا شاعرہ ہے لیکن پرنیہ وہ واحد تھی جس کی دسترس میں اسکے اشعار آپائے تھے۔اس کے علاوہ کسی کو ان میں دلچسپی نہیں تھی۔پرنیہ ہمیشہ سے اس کی رازدار رہی تھی جس سے وہ اپنے دل کی بات کہہ پاتی تھی۔ہاں بریخنہ اور اس کی سالوں پرانی چپقلش تھی جو آج تک چلتی آرہی تھی۔ لیکن اس نے اسے پہلے کبھی سیریئس لیا تھا جواب لیتی۔ویسے بھی وہ شادی کر کے جا چکی تھی۔

"کتنے اشعار لکھے؟" پرنیہ کافی شوقین تھی سماہا کی شاعری کی اسی لئے ہر وقت اس کے پیچھے پڑی رہتی تھی۔ لیکن سماہا اسے کچھ نہیں کہتی تھی۔وہ خاموشی سے اپنے کاغذات اسے پڑھنے

دیتی تھی۔ہر شاعر کی طرح سماہا کی شاعری بھی اس کے جزبات کی ترجمان تھی۔اور پرنیہ کے علاوہ اس گھر میں کون تھا جو اس نے جزبات کا خیال کرتا تھا؟ کوئی بھی نہیں۔

"ایک ہی بس۔" وہ ہلکی سی آواز میں بولی۔

"تمہیں اپنی کتاب پبلش کروانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہیئے سماہا۔" وہ ہر بار دہرائے جانے والی بات کر رہی تھی۔سماہا نے اس کو خاموش نظروں سے دیکھا۔

"کچھ چھپوانا ہوتا تو سالوں پہلے جب شاعری کرنا شروع کی تھی تب ہی چھپوا لیتی۔ویسے بھی ابھی میں تیار نہیں ہوں۔" اس نے بھی ہر مرتبہ والا جواب دیا تھا۔پرنیہ نے اس کو تنگ آکر دیکھا۔

Clubb of Quality Content

"کیا ہے سماہا۔کتنی بورنگ ہو تم۔" اس نے جھنجھلا کر کہا۔شاعرہ صاحبہ مسکرائیں۔وہ ایک خود شناس مسکان تھی۔

"شعراء بورنگ ہی ہوتے ہیں میری بہن۔" وہ کہہ کر ہنسی۔پرنیہ نے بھی اس کو مسکرا کر دیکھا۔

"ایک بات پوچھوں تم سے؟" اس نے جھجک کر کہا۔

"ہاں پوچھو۔"اس نے خوشی سے اجازت دی۔ کاغذات پر لفظ اتارنے کے بعد وہ کافی ہلکا محسوس کرتی تھی۔ ورنہ کاندھوں پر جیسے بوجھ پورا دن لدا رہتا تھا۔

"آپا کیوں تم سے بحث کر رہی تھیں آج؟"وہ کچھ جاننا چاہتی تھی۔ سماہا نے ایک گہری سانس خارج کر کے اسے دیکھا۔

"بس آج ان کی زبان پر لگا تالا کھل گیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ میں طلاق لے لوں۔"اس نے عام سے انداز میں بات کی۔

سماہا منیر بیگ نکاح یافتہ تھی۔ اس کا نکاح آٹھ سال پہلے ہوا تھا۔ جب وہ سولہ سال کی تھی۔ پہاڑی علاقے کے پٹھانوں کی اولاد تھی۔ اس لئے باپ نے کم عمری میں ہی اس کا نکاح اس کے تایا زاد کے ساتھ پڑھوا دیا تھا۔ یہ وہ ریت تھی جو دیر میں عام تھی۔ لیکن نکاح کے ایک ماہ بعد اس کے تایا کا انتقال ہو گیا۔ تائی پہلے ہی حیات نہیں تھیں۔ مگر اپنے تایا کے انتقال کے غم کے ساتھ ساتھ ایک اور درد کا پہاڑ اس کا منتظر تھا۔ اس کا نکاح اپنے باپ کی میت کو سرِ بازار تنہا چھوڑے جا چکا تھا۔ اور ایسا کیوں ہوا تھا کوئی نہیں جانتا۔ وہ شخص جس نے اس سے نکاح کیا تھا

وہ اسے اس کے گھر میں غیر شناخت چھوڑ گیا تھا۔بس جانے سے پہلے وہ اس پر ایک احسان کر گیا تھا۔وہ جانے سے پہلے اسے ایک خط لکھ گیا تھا۔

اور وہ خط ہی وہ سرا تھا جو اسے آج تک اس سے باندھے ہوا تھا۔سماہا منیر کو ایک فیصد بھی جدا ہو جانے کا خوف آج تک گھیر نہیں پایا تھا۔وہ خط اپنے آپ میں ایک ایسا مضبوط سہارا تھا جو اسے کھڑے رہنے پر مجبور کرتا تھا۔کیا یہ محبت تھی جس نے اس کے ارادے پختہ کر دیے تھے؟پتا نہیں۔

سماہا منیر کو اپنے شوہر سے محبت تھی یا نہیں یہ تو وہ بھی نہیں جانتی تھی۔لیکن ایک چیز جو اس کے اختیار میں تھی وہ تھی وفا۔سماہا منیر صرف اور صرف وفادار بیوی تھی۔وہ محض اپنے شوہر کے ساتھ وفا نبھا رہی تھی۔وہ نہیں جانتی تھی کہ کب تک وہ ایسے ہی تنہا دو کشتیوں کی سوار بنی رہے گی۔لیکن جو عقیدت ایک بیوی کو قدرتی طور پر اپنے شوہر سے تھی وہ اس کو اجازت نہیں دیتی تھی کہ اس خط کے بعد بھی وہ اپنے شوہر کو جھٹلا پاتی۔

"سماہا؟آخر وہ کیا چیز ہے جو تمہیں اس فرار شخص سے جوڑے ہوئے ہے؟"اور یہ تو پرنیہ بھی جانتی تھی کہ وہ طلاق کبھی نہیں لے گی چاہے اس کے لئے ابا کی نفرت سہنی پڑے یا آپا کی

صلواتیں سننی پڑیں۔ یہ اب سے نہیں سالوں سے اس کی روش تھی۔پرنیہ کے استفسار پر اس نے نہایت پیاری آنکھوں سے اسے دیکھا۔وہ پرامید آنکھیں تھیں۔

"وہ کوئی چیز نہیں وہ ایک وعدہ ہے۔وعدۂ وفا۔ایک بیوی کی بے لوث وفا ہے جو مجھے اس گمنام شخص سے باندھے ہوئے ہے۔"اس کا جواب صاف تھا۔ہر قسم کے شک سے پاک۔

پرنیہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"اس سے وفا نبھانا تم پر فرض نہیں ہے جبکہ وہ آٹھ سالوں سے غائب ہے۔کیا معلوم وہ کبھی واپس ہی نہ آئے؟"پرنیہ ہر فیصلے میں اسکے ساتھ تھی لیکن کبھی کبھی وہ اس کے اس فیصلے سے جھنجھلا جاتی تھی۔

"کیا تمہیں نہیں معلوم کہ شوہر کی غیر موجودگی میں بھی اس سے وفادار رہنے کا حکم ہے؟"اس نے نرمی سے کہا۔وہی آہستہ آواز جو اس کے لہجے کا خاصہ تھی۔

Clubb of Quality Content

"ہاں مگر وہ اتنے سالوں سے مفرور ہے۔اس نے کبھی تم سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی تم سے ملنے نہیں آیا۔اس کا کوئی پتا نہیں ہے۔کیا معلوم وہ دوبارہ شادی کر چکا ہو؟"اس نے اسے ہر ممکن صورتحال بتائی۔

"کیا معلوم وہ زندہ ہی نہ ہو؟"اس نے ہلکی سی آواز میں سرگوشی کی تھی۔پرنیہ نے آنکھیں پھیلائے اس کو دیکھا۔وہ ایسا کتنی آسانی سے کیسے کہہ سکتی تھی؟

"سماہا تم ایسی بات اتنے آرام سے کیسے کہہ سکتی ہو؟"وہ سخت حیران تھی۔جس شخص سے طلاق نہ لینے کی وجہ سے وہ سب کی نفرت سہہ رہی تھی وہ اسی کے بارے میں یہ سوچ رہی تھی۔اس کا دل نہیں کانپا؟

"کیونکہ اس کی موت ہی وہ واحد وجہ ہے جو اتنے سال اس کو مجھ سے دور رکھ سکتی ہے پرنیہ!"اس کا لہجہ نہایت پر یقین تھا۔پرنیہ اس عورت کے ایمان کو دیکھتی رہ گئی۔وہ اپنے رشتے کو لے کر کتنی واضح تھی۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

"تو کیا واقعی وہ حیات نہیں ہے؟" پرنیہ نے کافی مشکل سے یہ سوال کیا تھا۔اتنے سالوں کا انتظار اور یہ صلہ؟ سماہا نے پر تاثر آنکھوں سے اس کو دیکھا۔ وہ تاثر ایک اداسی سے بھری غیر یقینی کا تھا۔

"یہ وہ روح شکن سوال ہے جو میں روز اللہ سے کرتی ہوں۔" اس کا لہجہ پہلی مرتبہ گیلا ہوا۔ آنکھوں میں نمکین پانی جگہ بنانے لگا۔ پرنیہ نے آگے بڑھ کر ایک طرف سے اسے گلے لگایا۔ سماہا نے آہستہ سے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ اگر بہنوں سے دکھ نہ بانٹے جائیں تو شاید دل پھٹ جائیں۔

"تم پریشان مت ہو سماہا۔ اسے تم تک لانے کے لئے مجھ سے جو بن پایا میں کرو نگی۔" اس نے ایک عظم سے کہا تو سماہا نم آنکھوں سے مسکرائی۔ آنسو آنکھوں سے باہر آ چھلکے۔

"تم میری چھوٹی بہن ہو اور باتیں دیکھو کتنی بڑی بڑی کرتی ہو۔" وہ ہنستے ہوئے بے اختیار بولی۔ پرنیہ نے پیچھے ہو کر اسے گھورا۔

"چھوٹی بہنوں کو انڈر ایسٹیمیٹ کرنا یہ دنیا کب بند کرے گی؟ ویری ناٹ فیئر!" وہ سخت رنجیدہ تھی۔ آخر چھوٹی بہنوں کو کوئی کچھ کیوں نہیں سمجھتا؟ اگر یہی سوال پرنیہ سے اس سے

چھوٹی گلنور کرتی تو وہ کہتی چھوٹی ہو چھوٹی رہو۔پر نیہ کتنی جلدی پینترہ بدلتی تھی یہ تو سب جانتے تھے۔

"میں جانتی ہوں تم کتنی توپ چیز ہو پر نیہ۔" سماہا نے اسے پھر سے چھیڑا تو وہ اس سے دور ہو گئی۔سخت چتونوں سے اسے گھورا۔

"توبہ توبہ! کتنے برے لوگ ہیں دنیا میں۔اپنی ہی بہن کو سرِ عام بے عزت کر رہے ہیں۔" اس نے سخت مبالغہ آرائی کی۔

"سرِ عام؟" سماہا نے بھی اسے گھورا۔

"ہاں آخر پورے آسمان نے دیکھا ہے کہ تم نے مجھے توپ چیز کہا ہے۔" اس نے ہاتھ نچا نچا کر کہا۔سماہا نے اسے اوپر سے نیچے تک گھورا۔پوری توپ چیز تو تھی وہ۔

"دیکھو اب میں تمہارا دل رکھنے کے لئے جھوٹ تو نہیں بول سکتی۔" اس نے صاف صاف کہا اور وہاں سے بھاگ گئی۔پر نیہ نے منہ کھول کر اسے حیرت سے دیکھا۔کیسی کیسی بہنیں آ رہی ہیں آجکل مارکٹ میں؟ اتنی بے عزتی؟

"رکو وہیں پہ۔مجھے روسٹ کر رہی ہو تم سماہا کی بچی!" وہ بھی تخت سے اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگی لیکن سماہا اس سے پہلے سیڑھیاں اتر چکی تھی۔رات کا تاروں سے بھرا آسمان ان دونوں کو دیکھتے ایسے ہی چمکتا رہا۔

کبھی کبھی ہم اپنی زندگی میں موجود لوگوں کا احساس نہیں کر پاتے کہ کیسے وہ ہماری زندگی میں ہونے سے اسے کم گھٹن زدہ بنا دیتے ہیں۔کیسے ان کا ہونا ایک ہمت سے کم نہیں ہوتا۔ان سے چند منٹ کی بات کیسے ہمارے دل پر لگے زخموں کا مرحم بن جاتی ہے۔چاہے انسان میچورٹی کے اعلی درجے پر بھی ہو کہ وہ خود کے مسئلے خود ٹھیک کرنا بخوبی جانتا ہو۔پھر بھی وہ خواہش رکھتا ہے کہ اس کے پاس ایک ایسا شخص ہو جو اس کا بیک اپ ہو۔جس کا ہونا اس بات کا یقین ہو کہ چاہے جتنا بڑا بھی نقصان اس کے دل کو پہنچ جائے اس کے پاس ایک ایسا بیک اپ موجود ہے جو اسے آنے والے وقت میں سپورٹ کر سکتا ہے۔چاہے وہ زندگی کا ساتھی ہو یا کوئی دوست ہو۔بس وہ ہونا چاہیئے۔اگر کسی کے پاس ایسا شخص ہو تو وہ جان لے کہ وہ اس کے لئے اللہ کی عطا کردہ نعمتوں میں سے ایک ہے۔

خضر ہاؤس پر شام چھا چکی تھی۔ گھاس سے سجے برآمدے کے پودوں پر زدر مصنوعی فیری لائٹس جل چکی تھیں۔ رائنا کے کمرے کی بالکنی سے نیچے گرتی فیری لائٹس بھی پوری آب و تاب سے چمک رہی تھیں۔ سفیدی میں ڈوبا خضر ہاؤس رات میں بھی اتنا ہی دلفریب لگتا تھا جتنا کہ دن میں۔ جہاں پھول ہوں وہ جگہ کیسے نامکمل ہو سکتی ہے؟

اس وقت رائنا وارث اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ میز پر چائے کے لوازمات سجے تھے کیونکہ اس کے سامنے ادین کے بھیجے گئے وکیل صاحب بیٹھے تھے۔ اپنی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے وہ صبح آنے کی بجائے رات کو آئے تھے۔ وہ ادین کی ہدایات کے مطابق اس کام کو آج ہی مکمل کرنا چاہتے تھے۔

سر پر لئے سیاہ ریشمی دوپٹے کے ہالے میں رائنا کا دودھیا چہرہ چمک رہا تھا۔ آنکھوں میں کچھ تھکن اور نیند کا غماز تھا۔ وہ ابھی ابھی زری آپا کے بلانے پر اپنے کمرے سے اٹھ کر ان کے پاس آئی تھی۔

"یہ وہ کاغذات ہیں جن پر آپ کے دستخط درکار ہیں۔" وکیل صاحب نے اس کے سامنے میز پر کچھ کاغذات سرکائے۔ اس نے سر جھکا کر کاغذات کو دیکھا۔ وہ اب اسے پین پکڑا رہے تھے۔

"یہ کاغذات خضر صاحب نے خود اپنی منشاء کے مطابق بنوائے تھے اور یہ تب سے میرے پاس محفوظ ہیں جب وہ حیات تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ ذمہ ادین بیٹے نے لے لیا تھا کہ کاغذات آپ کے پاس باحفاظت پہنچیں۔" وہ غائب دماغی سے ان کی بات سنتی رہی۔ اس کی نظریں کاغذ پر لکھی گئی شقوں پر گئی۔ کاغذ پر ترتیب سے ایک ایک کر کے بنیادی شرائط لکھی ہوئی تھیں۔

ناولز کلب
Clubb of Quality Content

"ایک منٹ وکیل صاحب! میں یہ شقیں پڑھنا چاہتی ہوں۔" اس نے مصلحت آمیزی سے کہا۔ ایک ایک کر کے وہ ان کو دہراتی گئی۔

"یہ پلاٹ مکمل طور پر رائنا وارث حبیب کی ملکیت ہے اور کسی بھی غیر قانونی دعوے سے آزاد ہے۔"

"یہ پلاٹ رہائشی، تجارتی اور زرعی کسی بھی مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔"

"پراپرٹی کی فروخت یا منتقلی صرف رائنا وارث حبیب کے تحریری اجازت نامے کے ساتھ ممکن ہے۔"

"یہ پراپرٹی رائنا وارث حبیب کو صرف اس وقت منتقل کی جائے گی جب وہ قانونی طور پر پچیس سال کی عمر کی ہو اور شادی شدہ خاتون ہو گی۔اس سے قبل کسی بھی قسم کا قبضہ یا ملکیت کا دعویٰ قانونی طور پر جائز نہیں ہو گا۔"

اور یہ وہ شق تھی جس پر رائنا وارث نے باقائدہ آنکھیں پھیلا کر وکیل صاحب کو دیکھا۔

"یہ کاغذات بذات خود بابا نے بنوائے تھے؟"اس نے سوچا کہ شاید اسے ہی غلط فہمی ہوئی ہے۔اس نے ایک بار کنفرم کرنا ضروری سمجھا۔

"جی ہاں بیٹے! آپ کے بابا نے خود مجھے سامنے بٹھا کر مجھ سے یہ کاغذات بنوائے تھے۔اس میں موجود کوئی بھی لفظ ان کی مرضی کے بغیر نہیں لکھا گیا۔"وکیل صاحب نے اس کو یقین دلایا جو مشکوک آنکھوں سے کاغذ کر دیکھ رہی تھی۔اسے حیرانی ہوئی کہ ادین نے بھی اسے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ادین؟اسے ادین کو فوراً کال کرنے کا خیال آیا۔

"آپ مجھے کچھ وقت دیں وکیل صاحب۔مجھے ایک ضروری کال کرنی ہے۔"وہ انہیں حیرت میں چھوڑے ڈرائنگ روم سے واک آؤٹ کر گئی۔لاؤنج میں آ کر اس نے ہونٹ چباتے ادین کو کال کی تھی۔وہ مسلسل ادھر سے ادھر چکر لگاتے فون کان سے لگائے ہوئے تھی۔ادین فون نہیں اٹھا رہا تھا۔اس نے ایک ساتھ تین کالز کر ڈالیں۔تیسری کال کی پانچویں بیل پر کال اٹھالی گئی تھی۔

"رائنا میں ابھی مصروف۔۔۔۔"لیکن رائنا نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"کیا آپ نے کاغذات ایک بار پڑھے تھے؟کیا آپ کو شادی والی شق کا علم تھا؟"اس نے سیدھا اس سے مطلب کی بات کی۔

"کیا؟"رائنا کی بات مکمل طور پہ اس کے سر پر سے گزر گئی۔

"بابا کے بنوائے گئے پراپرٹی کے کاغذات میں ایک شق یہ ہے کہ رائنا وارث پچیس سال کی شادی شدہ عورت ہو کر زمین کی ملکیت حاصل کر سکتی ہے۔اس سے پہلے قبضہ غیر قانونی ہو گا۔"اس نے من و عن کاغذ پر لکھے الفاظ اس کو سنا ڈالے۔

"کیا؟واقعی بابا نے یہ شرط رکھی ہے؟"ادین کی آواز حیرت زدہ تھی۔اسے بھی اس قسم کی کسی تقاضے کی امید نہیں تھی۔

"جی ہاں! یہ شق اپنے پورے وجود کے ساتھ کاغذ کے عین وسط میں براجمان ہے۔"اس کے الفاظ بھی اس کی طرح تپے ہوئے تھے۔یہ اس کی لمحاتی کیفیت تھی۔وہ بہت پریکٹکل تھی مگر ایک دم سے ایسی شرط پڑھ کر وہ پراسیس نہیں کر پا رہی تھی۔بابا نے آخر کیا سوچ کر یہ شرط رکھی تھی؟جبکہ یہ کاغذات آج سے پانچ چھ سال پہلے بنوائے گئے تھے۔جب وہ اٹھارہ یا انیس سال کی تھی۔اور ابھی وہ پچیس کی بھی نہیں تھی۔

"تمہارے ٹوینٹی ففتھ برتھڈے میں ایک مہینہ ہی باقی ہے تو پریشان کیوں ہو رہی ہو؟پراپرٹی ٹرانسفر ہو جائے گی۔"ادین نے اس کو کچھ کالم کرنا چاہا۔

"میں نے کاغذات ملتے ہی جلد از جلد اپنے نئے آفس پر کام شروع کرنا تھا ادین۔اگلے مہینے پچیس سال کی تو ہو جاؤں گی لیکن یہ شادی والا معاملہ اب میں کیسے سالو کروں گی؟"وہ پریشان تھی کیونکہ اس معاملے میں اب شادی انوالو ہو چکی تھی۔اور شادی اس کے پلینز میں اگلے پانچ سالوں میں بھی نہیں تھی۔

"تم پریشان مت ہو۔ ہم اس شرط کو ختم کروا سکتے ہیں۔" ادین نے اس کو پر سکون رہنے کا کہا تو رائنا نے ایک گہری سانس خارج کی۔

"میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ مجھے میری زمین استعمال کر لینے دیں۔" اس نے ادین کو پھر سے یاد کروایا۔

"رائنا! بس وہ معاملہ ختم ہو گیا ہے۔ اس بات کو بار بار مت چھیڑو۔ تم وکیل صاحب کے پاس جاؤ اور انہیں اپنے فیصلے کے مطابق بتاؤ۔ وہ تمہیں گائیڈ کر دیں گے۔" رائنا نے خاموشی سے اس کی بات سنی اور کال کاٹ دی۔

"بابا! ہر بار کی طرح آج بھی میں آپ کا اگلا عمل نہیں جان پائی۔" اس نے آہستہ سے خود کلامی کی اور واپس ڈرائینگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ وکیل صاحب کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے بولنا شروع کیا۔

"ان کاغذات میں ایک ایسی شق ہے جو میری توقع سے باہر تھی وکیل صاحب! میں ایک دم سے اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ آپ یہ کاغذات یہیں چھوڑ جائیے۔" اس نے

ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنا موقف بیان کیا۔ بزرگ وکیل صاحب نے اسے شفقت سے دیکھا۔

"میں جانتا ہوں بیٹا کہ وہ کونسی شق ہے۔آپ یقیناً شادی والی شق کی بات کر رہی ہیں۔ خضر صاحب نے جب مسودہ بناتے وقت یہ شرط پیش کی تو میں نے انہیں ایسا کرنے سے روکا تھا۔ شادی ہر انسان کا شخصی حق ہے۔ میں نے انہیں آپ کو ایسی کسی شرط سے پابند کرنے سے باز رہنے کو کہا تھا۔" وہ رائنا کے چہرے پر موجود پریشانی کو بھانپ گئے تھے اس لئے اسے سچ بتانا چاہا۔رائنا خاموشی سے انہیں سنی گئی۔

"لیکن تب انہوں نے مجھ سے کہا کہ میری بیٹی نے کچھ ایسے زخم سہے ہیں جو اس نے کسی کو نہیں دکھائے۔ مجھے بھی نہیں۔ان زخموں کا مرحم اس کے لئے یہ شرط ہے۔" وہ خضر کے الفاظ دہرا رہے تھے۔رائنا نے یکدم عجیب نظروں سے انہیں دیکھا۔ان کی آنکھیں سچ بولتی تھیں۔آخر وہ خضر کے ساتھ کئی سالوں سے تھے۔

"میرا یقین کرو بیٹا انہوں نے یہ کہا تھا۔" رائنا ان کی بات پر سیدھی ہوئی۔اس کے دل میں ایک گہرا سا احساس اتر گیا۔وہ کچھ لمحے خاموش رہی، پھر آہستہ سے بولی۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ۔۔ابھی میں اس پراپرٹی پر قبضہ نہیں لے سکتی جب تک کہ میں شادی شدہ نہ ہوں اور پچیس سال کی نہ ہوں؟" وہ اب فیصلے کرنا چاہتی تھی۔ بابا کی بات سے جو وہ اخز کر رہی تھی ایسا وہ بلکل نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ وہ ہر گز نہیں چاہتی تھی کہ وہ پنہاں راز عیاں ہوں جو اس کے دل میں دفن تھے۔

"ایسا ہی ہے۔" وکیل صاحب بولے تھے۔

"تو پھر میں کیا کروں؟" اس کی آواز میں الجھن بھی تھی اور ضد بھی۔

وکیل صاحب نے عینک ناک پر درست کی اور قدرے جھک کر بولے۔

"بیٹی، اس شق کا مطلب یہ نہیں کہ آپ بے بس ہیں۔ قانون ہمیشہ راستہ دیتا ہے۔ اس معاملے میں صرف دو قانونی حل ہیں۔" رائنا نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"دو؟"

"جی۔" وہ ذرا ٹھہرے، پھر پہلا راستہ واضح کیا۔

"پہلا حل تحریری ترمیم ہے۔ اگر تمام قانونی فریقین کی رضامندی ہو یعنی آپ خود۔ تو ہم ایک ترمیم شدہ دستاویز بنا سکتے ہیں۔ اس میں واضح طور پر لکھا جائے گا کہ شادی سے متعلق

شرط کو ختم کیا جا رہا ہے اور پراپرٹی کی ملکیت آپ کو بلا شرط منتقل ہو گی۔ یہ کاغذ رجسٹریشن کے ذریعے محفوظ کر لیا جائے گا۔ یہ تیز اور پر سکون راستہ ہے۔" رائنا نے ہونٹ بھینچے۔

"اور دوسرا؟"

وکیل صاحب کی آواز سنجیدہ ہو گئی۔

"دوسرا راستہ عدالت ہے۔ اگر یہ شرط آپ کے بنیادی حق میں رکاوٹ بن رہی ہے تو آپ عدالت سے رجوع کر سکتی ہیں۔ عدالت یہ دیکھے گی کہ آیا شادی جیسی ذاتی چیز کو پراپرٹی سے جوڑنا قانونی طور پر درست ہے یا نہیں۔ اگر عدالت نے شرط کو غیر مؤثر قرار دے دیا تو آپ کو فوری طور پر ملکیت اور قبضہ مل سکتا ہے۔"

کمرے میں چند لمحے خاموشی چھا گئی۔ رائنا دوبارہ ہونٹ کترنے لگی۔ چند منٹ کمرے میں فیصلہ کن خاموشی چھائی رہی۔ پھر اس نے ایک آخری بار سر اٹھا کر وکیل صاحب کو دیکھا۔

"میں آپ کو کچھ دن تک یہ کاغذات دستخط کر کے پہنچا دوں گی۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ وکیل صاحب مسکرائے۔

"تو آپ کوئی قانونی قدم نہیں اٹھانا چاہتیں؟" انہوں نے ایک بار کنفرم کرنا چاہا۔ رائنا نے گردن اٹھا کر ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

"نہیں۔" اس کا یک لفظی جواب ہی اس یقین کا منہ بولتا ثبوت تھا جو اس کو خضر مراد کی ذات پر تھا۔ وہ ان کے چھ سال پہلے کئے گئے فیصلے کو آج اپنی منشاء کے خلاف قبول کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے باپ کی روح کو بھی اپنے انکار سے تکلیف پہنچانے کا سوچ نہیں سکتی تھی۔ کیا وہ ایسا کر پائے گی؟

یہ کیسی مٹی سے گوندھا تھا خدا نے ایک بیٹی کو؟ جو دل کو مار کر باپ کے فیصلے پر چلنا چاہتی تھی اور اس کا کوئی ملال بھی نہیں تھا۔

"ایک ہفتہ بعد۔۔۔"

اللہ کی زمین میں ہر طرف پھیلی سیاہی آہستہ آہستہ چھٹنے کے لئے تیار تھی۔ رات کا آسمان صبح کے مطلع میں تبدیل ہونے کو تھا۔ صبح کے پانچ بجے کا وقت تھا جب نہ آسمان سیاہ ہوتا تھا اور نہ ہی نیلا۔ فجر کی آذان کا وقت قریب تھا۔ نومبر کا آغاز ہلکی ہلکی خنکی کو ساتھ لایا تھا۔ سرد

فضائیں کیف و سرور میں مبتلا تھیں لیکن تھمی ہوئی تھیں۔ان تھمی ہوئی ہواؤں کے ساتھ اڑتے ہوئے اگر آرایم ہاؤس کی طرف آؤتو وہ بھی سیاہی میں ڈوبا تھا۔ہر سو خاموشی اور ویرانی چھائی تھی۔ایسی ویرانی جو دل کو دہلا دے۔لیکن یہ گھر دل دہلا دینے واقعات کے بعد بھی یوں کھڑا تھا جیسے اس پر کبھی کوئی آفت نہ آئی ہو۔اس گھر کی دیواروں نے اپنے سینوں پر جو غم لکھ رکھے تھے وہ یہ دیواریں ہی بتا سکتی تھیں کیونکہ اس گھر میں رہنے والے مکین گزرے ہوئے کل کی بات نہیں کرتے تھے۔لیکن یہ بلند دیواریں بھی لب سیے ہوئے تھیں۔سالوں سے کچھ نہیں بولی تھیں۔

کسی سفید بدروح کی طرح زمین سے چند انچ اونچائی پر لہراتے ہوئے تیزی سے سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اوپر آؤتو ایک وسیع لاؤنج تھا جو سیاہی میں گھرا تھا۔اس لاؤنج کے عین وسط میں کھڑے ہوئے گھوم کر چکر لگاؤ تو لکڑی کی فلورنگ سے سجا یہ لاؤنج ہلکی سی آہٹ پیدا کرتا تھا۔بائیں طرف ایک اوپن ٹیرس تھی جہاں سے نچلی منزل باہر سے دکھائی دیتی تھی۔لیکن ہماری توجہ نچلی منزل پر نہیں بلکہ اس دروازے کی طرف تھی جو اس لاؤنج کی دائیں جانب تھا۔

بھٹکتی ہوئی بدروح کی طرح بغیر کسی رکاوٹ کے دروازے سے اندر داخل ہو تو سب سے پہلی نگاہ اس کمرے کے ایک کونے میں رکھے بڑے بڑے کینوسز کی طرف جاتی تھی جس پر آرکیٹیکچرل ڈیزائین بنے تھے۔زمین پر بھی کچھ چارٹس بکھرے ہوئے تھے۔ساتھ ہی میز پر پنسل، برش،اور سیاہ پینٹ کی ٹیوبز بکھری پڑی تھیں۔سیاہ کے علاوہ کوئی پینٹ کلر وہاں موجود نہ تھا۔آرکیٹیکچرل سکیچ سیاہ کے علاوہ اسے کسی رنگ میں اچھا نہیں لگتا تھا۔

ایزل پر رکھے کینوس پر اس وقت جو سکیچ دکھائی دیتا تھا وہ کسی گنبد جیسی عمارت کا تھا۔یہ عمارت ایک نہایت وسیع رقبے پر پھیلی تھی۔نیچے سے عمارت مکمل گول شکل میں زمین پر کھڑی تھی اور اوپر کی جانب وہ ایک گنبد کی شکل اختیار کرتی جاتی تھی۔کینوس کے اوپر عمارت کا نام لکھائی دیتا تھا۔

Eternal Past Museum

یہ ایک عجائب گھر کا سکیچ تھا جو راحب حسین بیگ نے خود سکیچ کیا تھا۔اس منصوبے میں وہ صرف معمار نہیں تھا وہ اس خیال کا خالق تھا جس پر یہ میوزیم قائم ہو گا۔سٹرکچرل انجینیئرز اور کنسلٹنٹ اس منصوبے کو منظرِ عام پر آنے کے بعد دیکھ کر مزید اس پر کام کرنے والے

تھے۔جب سے گورمنٹ کی اس مشہور کمپنی نے آر ایم آر کیٹیکٹس سے رابطہ کیا تھا تب سے دن رات وہ اس کام میں لگا تھا۔اور اب کچھ دنوں میں یہ تخلیق مکمل ہونے کو تھی۔یہ پراجیکٹ ابھی اس نے سائن نہیں کیا تھا۔اس کی میٹنگز جاری تھیں۔ابھی کسی قسم کا کانٹریکٹ اس نے کمپنی کے ساتھ سائن نہیں کیا تھا۔بلکہ ابھی بات ہوا میں ہی تھی۔

میوزیم کے سکیچ کو اس کی جگہ پر چھوڑے پورے کمرے کو ایک نظر دیکھو تو اس میں بھی بنیادی رنگ سیاہ تھا۔ہر چھوٹی چھوٹی جگہ پر سیاہی کا تاثر تھا۔سیاہ بیڈ شیٹ، سیاہ پردے اور سیاہ ہی فریمز۔بس کمرے کی دیواریں آف وائٹ کریم روغن میں رنگی تھیں جو اس کمرے میں کچھ زندگی کو دوڑا دیتی تھیں۔کمرے کا مکین نہایت صفائی پسند تھا۔ہر چیز ترتیب سے اسکی جگہ پر رکھی تھی۔پردے نفاست سے اپنی جگہ پر جمے تھے۔بس اس کے کمرے میں موجود اس کا ڈیزائننگ ایریا کچھ الجھا بکھرا تھا۔کمرے کا مکین خود سویا ہوا تھا۔بیڈ پر سیدھا لیٹے دونوں ہاتھ سینے پر دھرے تھے۔وہ سکون سے سویا ہوا دکھائی دیتا تھا۔لیکن ایسا نہیں تھا۔

پاس آکر دیکھو تو اس کے چہرے کے خدوخال تنے ہوئے تھے۔بھنویں آپس میں بھینچی ہوئی تھیں۔وہ شاید کسی خواب کے زیرِ اثر تھا اور وہ خواب کوئی اچھا خواب نہیں لگتا تھا۔معاً اس کی

سانسیں تیز ہوئیں۔وہ اب سوتے ہوئے ہی گہرے گہرے سانس لے رہا تھا جیسے نیند میں ہی اس کیفیت سے باہر آنا چاہ رہا ہو۔اسکے لب ہلکے سے واہ ہوئے۔وہ کوئی سرگوشی کر رہا تھا۔

"مجھے باہر مت نکالیں خالو!"وہ بھینچی ہوئی آواز میں بول رہا تھا جیسے وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ نیند میں بول رہا ہو۔

"خالو! پلیز باہر برف باری ہو رہی ہے۔یہاں بہت سردی ہے۔"وہ نا جانے کس کی منت کر رہا تھا۔اس کی آواز کانپ رہی تھی جیسے وہ آج بھی برف کی اس سردی کو محسوس کر پا رہا ہو۔

"خالہ پلیز خالو سے کہیں مجھے اندر آنے دیں۔"اپنی یہ آوازیں آج بھی اس کے دماغ میں گونجتی تھیں۔

"خبردار جو تم اس گھر کے قریب نظر آئے۔"اب اسے کسی اور کی آواز سنائی دینے لگی۔

"جاؤ اور جا کر مزدوری کرو۔یہاں سے تمہیں ایک پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی۔"اف یہ آوازیں۔اسکی سانسیں اب مزید تیز ہونے لگی۔

"آئندہ یہاں آئے تو محب کو بھی گھر سے باہر نکال دوں گا۔"اس کا جسم کپکپاہٹ کی زد میں تھا۔پلکیں ہل رہی تھیں۔

"تم قاتلوں کے خاندان سے ہو منحوس!"اور اب اس کی آنکھیں ایک جھٹکے سے کھلیں۔وہ سیدھا چت لیٹا ہوا تھا۔اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔جسم پسینے میں شرابور تھا۔وہ چند سیکنڈ غائب دماغی سے کمرے کی چھت کو دیکھے گیا۔پھر اس نے سستی سے آنکھیں موند لیں اور سانس برابر کیا۔

"کم سٹریس لیا کرو راحب حسین!ورنہ یہ خواب جان نہیں چھوڑیں گے۔"اس نے آہستگی سے خود کلامی کی۔وہ اپنی کیفیت سے باہر آگیا تھا۔بس اتنی سی دیر لگتی تھی اس کو ان خوابوں کو بھلانے میں۔وہ ان کا عادی تھا۔لیکن سٹریس پر اس کا اختیار نہیں تھا۔پچھلے دو ہفتوں سے وہ اتنا زیادہ مصروف تھا اور ساتھ میوزیم کے سکیچ کی ٹینشن نے اس کو گھیر رکھا تھا۔آفس میں کنسٹرکشن جاری تھی۔نئے گھر کو بھی وہ فائنلائز کر چکا تھا۔وہ ایک منٹ کے لئے بھی چین نہیں لے پاتا تھا۔اور اس اوورورک کا نتیجہ آج اسکے سامنے تھا۔یہ خواب اس کو تب ہی آتے تھے جب وہ کافی زیادہ سٹریس لے لیتا تھا۔

وہ کمفرٹر پیچھے ہٹاتا اٹھ بیٹھا۔ فجر کی آذان ہو رہی تھی۔ سیاہی کچھ کچھ چھٹنے لگی تھی۔ اس نے بازو اوپر کر کے سٹریچ کیئے۔ پھر گردن کو دائیں بائیں سٹریچ کیا۔ ایک نظر کینوس پر ڈالی اور اٹھ بیٹھا۔ چند منٹ بعد وہ واشروم سے نکل رہا تو شرٹ آدھی گیلی تھی۔ وہ وضو کر کے نکلا تھا۔ گیلے کف فولڈ کر کے اس نے سائیڈ میز سے جائے نماز اٹھایا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کا رخ ٹیرس کی جانب تھا۔

ٹیرس میں نماز پڑھنے کے بعد وہ بغیر دعا کیے وہاں سے اٹھ گیا۔ آسمان کی نیلاہٹ بڑھ چکی تھی۔ وہ ٹیرس سے نکلتے نیچے آیا اور سیدھا سٹڈی کا رخ کیا۔ ہلکا سا سر گرا کر سٹڈی کے دروازے سے اندر جھانکا۔ توقع کے عین مطابق محب ہمیشہ کی طرح سینے پر کتاب گرائے بڑے سے لکڑی کے میز کے پیچھے رالنگ چیئر پر ہی سویا ہوا تھا۔ محب کو آج پھر اس حالت میں دیکھ کر اس نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔ آخر وہ جا کر سکون سے اپنے کمرے میں بیڈ پر کیوں نہیں سوتا؟

اس کو وہیں چھوڑے وہ لاؤنج سے گزر کر کچن میں آ گیا۔ اپنے لئے ہاٹ کافی بنا کر وہ باہر لان میں آ گیا۔ گھر میں سنسانی گونج رہی تھی۔ یہ گھر اس قدر خاموش تھا کہ ہلکی سی آہٹ بھی دہلا

دیتی تھی۔لان کا آسمان اب روشن تھا۔پرندے اپنے گھروں سے نکل چکے تھے۔ہوا بھی سرد تھی۔اس کو یکدم سردی لگی لیکن وہ ویسے ہی بے نیازی برتتا رہا۔کافی کے گھونٹ بھرے وہ سرسبز لان میں بیٹھا اپنی سوچوں سے لڑ رہا تھا۔

"تم قاتلوں کے خاندان سے ہو منحوس!"ایک بار پھر وہی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی لیکن اس نے سر جھٹک دیا۔ان آوازوں سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پانے کا انتظام وہ کر چکا تھا۔جلد ہی یہ صدائیں اس کا ساتھ چھوڑ جائیں گی۔اور یہ ممکن بنانے کے لئے پہلا پتا وہ پھینک چکا تھا۔اس کی آنکھیں ایک عجیب تاثر کو ہمہ وقت اپنے اندر بسائے رکھتی تھیں۔جیسے وہ راز کو عیاں بھی کرنا چاہتا ہو اور چاہتا ہو کہ بھید بھی نہ کھلے۔ایسا کرنا ابھی اس کی مجبوری تھی۔کافی کا گھونٹ بھرتے اس نے مدھم سی سرگوشی کی۔

"ہر انسان کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بچے بچپن میں اپنے ساتھ دہرائے جانے والا سلوک کبھی نہیں بھولتے۔"

میڈیکل کالج کے سرسبز گراؤنڈ میں چمکدار دھوپ چھن کر گر رہی تھی۔ طلباء ادھر سے ادھر جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے میں وہ ایک سایہ دار درخت کی چھاؤں میں بیٹھی تھی۔ کمر درخت کے تنے سے جوڑ کر ٹیک لگا رکھی تھی۔ آج پھر اماں کی کال آئی ہوئی تھی۔ ان کی دی گئی مدت آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔

"کب آ رہے ہیں تایا ابو؟" اس کی آواز معمول کے خلاف افسردہ تھی۔

"دو تین ہفتے تک آ جائیں گے۔" اماں اس طرف بھی افسردہ تھیں۔

"اماں کیا یہ واقعی ضروری ہے؟" وہ دل برداشتہ ہو رہی تھی۔ یہ منگنی اس کے لئے ایک ایسی رسی تھی جس کو اسے اپنے گلے میں ڈال کر گھومنا تھا۔

"ہاں۔ اگر چاہتی ہو کہ ڈاکٹر بن سکو تو یہ ضروری ہے۔" انہوں نے اس کو حقیقت کا رخ دکھایا۔

"یہ ایک ایسی گرہ ہے جو بابا نے تمام عمر کے لئے میرے دل میں ڈال دی ہے۔" وہ گھاس کترتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ بابا سے کسی بھی قسم کی اٹیچمنٹ نہ ہونے کے باوجود بھی وہ ان سے اپنے مطلب کی بات کرنے سے کتراتی نہیں تھی۔ جب سے اماں نے اسے اظفر سے

منگنی کا کہا تھا تو وہ بارہا ابا کو کال کرنے کے بارے میں سوچ چکی تھی لیکن ایسا وہ صرف ایک وجہ کی بدولت نہیں کر پا رہی تھی۔اور وہ تھی دو سال پہلے ان دونوں کے درمیان قائم ہونے والی شرط۔ابا نے اس کی ضد کو تسلیم کیا تھا اور اب اس کی باری تھی۔اگر وہ ایسا نہیں کرے گی تو اس کے نتائج وہ جانتی تھی۔اپنے باپ کی فطرت سے ہر کوئی واقف ہوتا ہے اور وہ بھی تھی۔یہ وہ معاملہ تھا جس پر وہ اپنی پختون روایات سے آج بھی بندھے تھے۔وہ اس کو کسی قسم کی چھوٹ نہیں دیں گے۔

"تمہیں ایسا کچھ بھی سوچنے کی ضرورت نہیں ہے ماحور۔بس منگنی کرنا اور آجانا۔چاہے اگلے دن ہی واپس آجانا۔میں تمہارے بابا کو منالوں گی۔"انہوں نے اس کے دل پر سے کچھ بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی۔اتنا تو وہ اس کے لئے کر ہی سکتی تھیں۔

"ٹھیک ہے اماں! میں آپ کو آنے کے بارے میں بتادوں گی۔فلحال تو میرے امتحانات ہیں۔"اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔وہ کالج کے گراؤنڈ میں بیٹھی تھی جہاں اس وقت اس کے علاوہ بھی کئی طلباء بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔اس نے ایک نظر پورے احاطے میں گھمائی۔دھوپ سے آنکھیں کچھ چندیائی ہوئی تھیں۔

"اماں میں آپ کو بعد میں کال کرتی ہوں۔خدا حافظ!"اس نے سبین کو دور سے اپنی طرف آتے دیکھا تو کال کاٹ دی۔وہ چلتے ہوئے قریب آئی اور دھپ سے گھاس پر بیٹھ گئی۔ماحور نے مسکرا کر اس کو دیکھا۔

"اسلام علیکم!کیا ہوا ہے؟"وہ اس کو ہنس کر دیکھ رہی تھی جس کے ماتھے پر بے شمار بل تھے۔وہ تپی ہوئی لگتی تھی۔

"ہونا کیا ہے؟سر جبار کے پاس گئی تھی اسائنمنٹ کا کچھ ڈیٹا اکٹھا کرنے۔انہوں نے صاف میرے منہ پر انکار کر دیا۔"وہ سخت عاجز آئے کہہ رہی تھی۔ماحور ابھی بھی ہنس کر اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم ان کے پاس گئی ہی کیوں؟ہمارا تو سارا ڈیٹا مکمل ہو گیا ہے نا؟اب تو بس کام شروع کرنا ہے۔"ماحور نے اس سے اس بے وقوفی کی وجہ پوچھی۔اتنا تو وہ ان ہفتوں میں اندازہ لگا چکی تھی کہ سر جبار بہت سخت قسم کے استاد واقع ہوئے تھے۔اسائنمنٹ میں کسی طرز کی مدد کرنا تو دور وہ تو اسے اپنے آفس میں ہی نہ داخل ہونے دیتے۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

"تو؟استاد کو ہر وقت سٹوڈنٹ کی مدد کرنی چاہیئے۔ایسے مدد کرنے سے کون سا استاد ہاتھ کھڑے کرتا ہے؟"وہ ابھی بھی کچھ سننے کو راضی نہیں تھی۔

"اچھا اب بس بھول جاؤ۔کیوں خود کا دل جلاتی ہو۔وہ تو ایسے ہی ہیں۔"اس نے اسے تسلی دی۔راضی وہ ابھی بھی نظر نہیں آتی تھی۔

"ہنہہ!"اس نے نخوت سے سر جھٹکا۔ماحور اسکی حرکت پر ہنس دی۔

"تم فون کان سے لگائے کس سے بات کر رہی تھی جب میں یہاں آئی؟"اس نے موضوع خود ہی بدل دیا۔

"ایبٹ آباد سے اماں کی کال تھی۔"اس نے سچ بتا دیا۔

"اور منہ کیوں لٹکا ہوا تھا؟"سبین نے مزید کریدا۔

"منگنی کروانا چاہتے ہیں میرے بابا اپنے بھتیجے سے۔"اس نے اکتا کر بے زاری سے کہا۔

"کیا واقعی؟واہ بھئی۔ہمارے ماں باپ کو کیوں یہ نیک خیال نہیں آتا۔"وہ فریفتہ ہوئی دل کے پھپھولے پھوڑے بول رہی تھی۔ماحور نے اس کو تیز نظروں سے گھورا۔

"میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو شادی کرنے کے لئے مری جا رہی ہیں۔ تمہیں زیادہ شوق ہے تو میری جگہ جا کر تم کر لو۔" اس نے غصے سے کہا۔ کہاں کا غبار کہاں نکل رہا تھا۔

"ارے بھئی تم تو غصہ ہی ہو گئیں۔ کیا ابا کا بھتیجا نہیں پسند؟ کسی اور کو پسند کرتی ہو؟" سبین نے مفروضہ لگایا۔

"نہ کوئی اور پسند ہے اور نہ ابا کا بھتیجا۔ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی تھی۔" وہ بے چینی سے کہہ رہی تھی۔

"تو کیا ہوا؟ شادی تھوڑی کر رہے ہیں۔ منگنی ہی ہے۔ کر لو۔" سبین اور اس کے مشورے۔ ماحور نے تنگ آ کر اسے دیکھا۔

"ہاں۔ کر والوں تاکہ ایک اظفر نامی بلا میرے پیچھے پڑ جائے۔" اس کا لہجہ درشت تھا۔

"بہت ہی بدذوق ہو تم ویسے۔ منگیتر آگے پیچھے گھومے تو لڑکیاں اتراتی شرماتی ہیں اور تم جھنجھلا رہی ہو۔" سبین کچھ زیادہ ہی ڈیلیوشنل تھی۔

"نہیں۔ میں نہیں اتراتی۔" اور ماحور کچھ زیادہ ہی بقول سبین بدذوق۔ اب ماحور اسے کیا بتاتی کی اظفر کس قسم کا انسان تھا۔

"تو کیا پھر تمہارے پاس کوئی اور آپشن ہے؟" سبین نے اس کے لہجے میں موجود بے زاری کو بھانپ لیا تھا۔ وہ واقعی پریشان تھی اس منگنی سے۔

"نہیں۔ میں پھنس چکی ہوں۔" اس نے سر ہاتھوں میں گرالیا۔ سبین نے اس کو ترحم سے دیکھا۔ لڑکیاں منگنیوں پر تب اتراتی ہیں جب وہ راضی ہوں اور وہ کہیں سے رضامند دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"تم پریشان نہ ہو۔ منگنی ہی تو ہے۔ شادی تو نہیں نا۔" اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے کہا۔

"یہی بات میں اتنے دنوں سے خود کو سمجھا رہی ہوں۔ لیکن میں جانتی ہوں آخر میں میں اپنے بابا کی بات مان لوں گی۔ یہی ہمارے درمیان طے ہوا تھا۔" اس نے آخری بات سرگوشی میں کی۔

"اچھا چلو موڈ ٹھیک کرو۔ آؤ تمہیں سموسے کھلاتی ہوں وہ بھی اپنے پیسوں سے۔" اس نے کھلے دل سے آفر کی۔ ماحور نے اپنا دکھ بھلائے سر اٹھا کر اسے بشاشت سے دیکھا۔ کھانوں کی شوقین ماحور آدم کے کان کھڑے ہو چکے تھے۔

"واقعی؟ تم اپنے پیسوں سے کھلاؤ گی؟" اس نے تصدیق کرنا چاہی کہ کیا پتا بعد میں مکر جاتی۔ کنجوس بھی تو بہت تھی۔

"ہاں بھئی۔ کیا یاد کرو گی۔ آجاؤ!" اس نے چہک کر کہا تو دونوں اپنے بیگز کندھے پر ڈالے اٹھ گئیں۔ کینٹین تک جاتے ہوئے وہ دونوں اسائنمنٹ کے بارے میں بات کرتی رہیں۔

طلباء کے رش سے بھری کینٹین میں قدم رکھتے ہی مختلف کھانوں کی مہک ماحور کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ ایک ٹیبل منتخب کرتے ہی وہ اس پر بیٹھ گئی۔ سبین سموسوں کا آرڈر دینے جا چکی تھی۔ وہ مسرور سی بیٹھی اپنی کتاب کے پنے پلٹتی رہی۔ کبھی فون چیک کر لیا۔ کبھی پھر سے کتاب اٹھالی۔ اسی دوران کسی نے انگلی سے میز کو کھٹکھٹایا تھا۔ گردن اٹھائے اس نے آنے والے کو دیکھا۔ بازوؤں میں پٹ پٹ آنکھیں جھپکاتا خرگوش پکڑے صالح خان اس کے سامنے تھا۔ وہ بے اختیار اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔ صالح نے بازو آگے کر کے خرگوش اس کی طرف بڑھایا۔

"آپ کی امانت۔" دل کو اپنی طرف کھینچنے والا نہایت نرم لہجہ۔ ماحور نے سر کو آہستہ سے خم دے کر اس سے خر گوش لے لیا۔ وہ اس وقت یہاں اس کے آجانے کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

"شکریہ! مجھے لگا شاید آپ بھول گئے تھے۔" وہ واقعی یہی سمجھی تھی۔ ان کی آخری ملاقات ایک ہفتہ پہلے ہی ہوئی تھی۔

"میں امانتیں ضبط کرنے والا لگتا ہوں کیا؟" صالح کے سوال پر اس نے بے اختیار اسے دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"نہیں۔ آپ امانتیں چکانے والے لگتے ہیں۔" جو اس نے پہلی مرتبہ اس کے لئے محسوس کیا تھا وہ آج بتا رہی تھی۔

"ویل! یہ تو امانت دینے والے شخص پر بھی ڈیپینڈ کرتا ہے کہ کون دے رہا ہے۔" اس نے محظوظ ہو کر کہا۔ ماحور نے حیرت سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"آپ فلرٹ کر رہے ہیں؟ ایسے لگتے تو نہیں ہیں۔" وہ کچھ خفگی سے کہہ رہی تھی۔ صالح نے یکدم مسکرانا روک کر اسے آنکھیں چھوٹی کر کے دیکھا۔

"یہ فلرٹ ہے؟ مجھے لگا میں ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں۔" وہ دونوں ہاتھ پشت پر باندھ کر بولا۔

"نہیں۔ یہ حقیقت نہیں ہے۔ سامنے والا کوئی بھی ہو، امانت کا حق نبھانا چاہیئے۔" وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔

"آپ مجھے ہر بار غلط ثابت کرنا چاہتی ہیں۔" وہ مصنوعی دکھ سے بولا۔ پہلے پارک اور آج کینٹین۔ آہ! اگر وہ عام مرد ہوتا تو یہ اس کی انا پر گہرا وار ہوتا۔

"مجھے غلط کو غلط بولنے پر کوئی ملال نہیں ہے۔" وہ اپنی بات پر کافی کانفیڈنٹ تھی۔

"مجھے میرے ویوز میں کوئی غلط ثابت نہیں کر پاتا۔ اور آپ نے آج دوسری مرتبہ کیا ہے۔"

"وہ واقعی متاثر نظر آتا تھا۔ ماحور نے محض کندھے اچکائے۔

"ارے صالح! اسلام علیکم۔ آپ ادھر؟" مس سبین سموسوں کی پلیٹ اٹھائے اس کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ صالح نے سر کے خم سے سلام کا جواب دیا۔

"یہ پیارا سا خرگوش یہاں کیا کر رہا ہے؟" اس کی نظر خرگوش پر گئی تو وہ پلیٹ میز پر رکھے خرگوش کو اٹھا چکی تھی۔ اپنا چہرا پاس کر کے ناک خرگوش کی ناک سے رگڑی۔

"یہ ایک ہفتہ پہلے مجھے مس ماحور کے پاس زخمی ملا تھا۔ میں نے اس کی مرحم پٹی کر کے، کچھ دن کھلا پلا کر اپنے پاس رکھا اور آج ان کو واپس کر دیا۔" اس نے تفصیلاً جواب دیا۔ سبین نے اچکا کر ماحور کو دیکھا۔ ماحور جانتی تھی اب وہ اس سے ایک ایک بات اگلوائے گی۔ بھنویں جتنی وہ خاموشی پسند تھی اسے یہاں اتنی ہی باتونی دوست مل گئی تھی۔

"اچھا اچھا! چلیں آئیں۔ ہمیں جوائن کریں۔" اس نے صالح کو بھی کھلے دل سے پیشکش کی لیکن صالح نے نرمی سے انکار کر دیا۔

"میری سر جیکل کلاس ہے ابھی۔ میں بس ان کی امانت ان کو واپس کرنے آیا تھا۔" وہ کالج آنے کے بعد اسے ڈھونڈتے سیدھا ادھر ہی آیا تھا۔

"لیکن آپ نے ہماری اسائنمنٹ میں مدد کی تھی اس کے لئے ہمیں شکریہ کا موقع آپ دیں گے۔" سبین اپنی پیشکش پر مصر تھی۔

"ضرور!" صالح نے نرمی سے آفر قبول کی اور مڑ گیا۔

"شکریہ ڈاکٹر صالح!" ابھی وہ مڑا ہی تھا جب اسے ماحور کی آواز سنائی دی۔ اس نے ٹھہر کر چہرہ گھمایا اور اسے دیکھا۔ وہ آنکھوں میں پاکیزہ تشکر لئے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سر کو خم

دیا۔یہ اس کا شکریہ قبول کرنے کا اشارہ تھا۔ماحور کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ جھلک دکھا کر غائب ہو گئی۔ صالح نے چہرہ سیدھا کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کینٹین سے نکل گیا۔

"یہ خرگوش کا کیا معاملہ ہے؟ چلو شروع ہو جاؤ۔" سبین کی تمام تر توجہ اس کی طرف ہو چکی تھی۔اب اسے اس کو ساری روداد سنانی پڑنی تھی۔ماحور نے ایک سرد آہ بھرتے بولنا شروع کیا تھا۔

دِیر، پاکستان۔

سرسبز درختوں اور مخملی گھاس سے بھرا گھر سورج کی کرنوں کو موڑ کر چھاؤں میں ایستادہ تھا۔پہاڑی علاقہ تھا تو ٹھنڈ پہلے ہی بہت تھی لیکن درختوں کی چھاؤں میں بیٹھنا اس گھر کے مکینوں کو کافی پسند تھا۔گھاس پر موٹے قالین بچھا کر کھلے آسمان کے نیچے دستر خوان لگایا گیا تھا۔گھر کی لڑکیاں وقفے وقفے سے زمینی دستر خوان پر کچھ رکھنے آتی تھیں۔گھر کے مرد ابھی کھانا کھانے نہیں آئے تھے۔جب تک عورتیں مکمل دستر خوان نہیں سجا لیتی تھیں تب تک وہ اپنے کمروں سے نہیں نکلتے تھے۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

"پرنیہ! جاؤ اور اس مہارانی کو بھی بلا لاؤ جو کمرے سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ تیور اس کے آسمان کو چھو رہے ہوتے ہیں سارا دن۔" یہ آواز پرنیہ کی ماں کی تھی جو اسے سماہا کو بلانے کا کہہ رہی تھیں۔ پرنیہ برتن دستر خوان پر رکھ رہی تھیں۔

"امی! ایسی بھی کوئی آگ نہیں نکالتی منہ سے وہ۔" اس نے بہن کی طرف داری کی تو اماں نے اسے درشتی سے گھورا۔ وہ ہنستے ہوئے زبان دانتوں تلے دبائے اٹھی اور اندر صحن کی طرف چلی گئی جہاں سماہا اور اس کا کمرہ تھا۔ یہ حصہ گھر کی پچھلی جانب تھا جو اندر سے گھر سے ملحقہ تھا۔ عام طور پر یہ بس مہمانوں کے لئے ہی استعمال ہوتا تھا۔ لیکن یہاں موجود کمروں میں سے ایک سماہا نے چند

سال پہلے خود کے لئے مختص کر لیا تھا جب وہ اٹھارہ سال کی تھی۔ اسے کیلیگرافی کرنی ہوتی تھی جس کی بدولت وہ اپنا سارا سامان اٹھا کر مہمان خانے کے ایک کمرے میں چلی آئی۔ یہاں اس کو وہ سب مل گیا تھا جو اسے درکار تھا۔ تنہائی اور بے تحاشہ خاموشی۔ لیکن وہ زیادہ دیر یہاں اکیلی نہیں رہ پائی تھی۔ پرنیہ صاحبہ کچھ مہینے بعد اپنا سارا بوریہ بستر سمیٹے اس کے کمرے میں آدھمکی تھی۔ بقول اس کے وہ اس کے بغیر سو نہیں پاتی تھی۔ لیکن یہ تو سماہا جانتی تھی کہ

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ سماہا کے شوہر کے دِیر سے چلے جانے کے بعد سماہا کی خود ساختہ تنہائی کی خواہش کو ختم کرنے کیلیئے وہ اس کے ساتھ اس کے کمرے میں شفٹ ہو گئی تھی۔ سماہا کے لاکھ نکالنے کے باوجود وہ آج تک یہیں تھی۔ دروازہ دھکیلتے ہوئے پرنیہ اندر داخل ہوئی اور اسے دیکھا جو میز پر بیٹھی حسبِ معمول اپنے مشغلے میں مصروف تھی۔

"امی سے مزید باتیں نہیں سننی تو آجاؤ۔ دستر خوان لگ چکا ہے۔" وہ قدم قدم چلتی اس تک آئی اور اس کے ہاتھوں سے قلم کھینچ لیا۔ سماہا نے جھٹکے سے سر اٹھایا اور غصے سے اسے دیکھا۔

"دوبارہ ایسا کیا تو مار کھاؤ گی۔" اس نے تیزی سے قلم اس کے ہاتھ سے واپس لینا چاہا لیکن پرنیہ نے وہ اس کی پہنچ سے اور دور کر دیا۔ سماہا نے جھنجھلا کر اسے دیکھا۔

"پہلے کھانا پھر کیلیگرافی۔" پرنیہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ وہ ایسے ہی ضد کر کے اس کا خیال رکھی تھی۔ چھوٹی بہن تھی لیکن بڑی کی طرح رعب جھاڑتی تھی۔ سماہا نے خاموشی سے کرسی گھسیٹی اور اٹھ گئی۔ پہلے کبھی اس پرنیہ نے اس کی ضد مانی تھی جو آج مانتی۔

"چلو۔" وہ اسے خفگی سے ہاتھ سے اشارہ کر کے باہر جانے لگی۔ پرنیہ بھی قلم اس کی جگہ پر واپس رکھے اس کے ساتھ ہی باہر نکلی۔ وہ دونوں ساتھ ہی باہر برآمدے میں آئیں۔ اس

دوران گھر کے مرد بھی کھانا کھانے آچکے تھے۔وہ دونوں خاموشی سے بڑے سے دستر خوان کی ایک جانب بیٹھ گئیں۔

"بسم اللہ کریں سب۔" یہ اس کے ابو کی آواز تھی۔وہ گھر کے سربراہ تھے اس لئے ان سے پہلے کوئی کھانا شروع نہیں کرتا تھا۔

منیر صاحب اور ان کے بھائی فاروق آپس میں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔وہ تین بھائی تھے جن میں سے ایک کا انتقال ہو چکا تھا۔وہ سماہا کے سسر تھے۔فاروق تایا کے بچے بھی ان کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ان کے تین بیٹے اور تین بیٹیاں تھی۔دو بیٹے شادی شدہ تھے جبکہ ایک ابھی شہر میں پڑھ رہا تھا۔فاروق تایا کی ایک بیٹی بھی شادی شدہ تھی جبکہ دوسری بیٹی کی شادی جلد ہونے والی تھی۔تیسری ابھی چھوٹی تھی۔بڑے سے دستر خوان پر گھر کے سارے افراد موجود تھے۔

"بھائی صاحب۔نگین کی شادی کی تاریخ کب پکی کرنی ہے؟ منیر صاحب نے سب کا دھیان اپنی طرف کروایا۔منیر صاحب اپنے بڑے بھائی کی بہت عزت کرتے تھے۔ان کا ہر فیصلہ ماننا ان

کے لئے ضروری ہوتا تھا۔اس کے لئے کبھی کبھی ان کا اپنا خاندان بھی پسِ منظر میں چلا جاتا تھا۔

"لڑکے والے ہی تاریخ دیں گے منیر۔میں جا کر مانگتا اچھا لگتا ہوں؟" فاروق صاحب نے درشتی سے کہا۔وہ ہمیشہ سے سخت گیر طبیعت کے تھے۔اور اب تو سب ان کے اس لہجے کے عادی ہو گئے تھے۔

"بھائی جان! میرا مشورہ ہے کہ تاریخ خود ہی جا کر مانگ لیں۔میری غلطی مت دہرائیں ورنہ جانے کب تک لڑکی کو گھر میں بٹھانا پڑے۔" انہوں نے پتھر لہجے میں کہا جیسے جس کی بات ہو رہی تھی اس سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔بس ایک لمحے کو کھانا کھاتی سماہا کے ہاتھ ان کی بات پر تھمے پھر ویسے ہی وہ نوالہ توڑنے لگی۔ان باتوں کو سنتے ہوئے کئی سال ہو گئے تھے۔یہ کوئی نئی بات تو نہ تھی۔اب تو عادت تھی۔

"تمہیں کون روک رہا ہے؟ تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ اس کی شادی کروا دو۔وہ جانے کب کا مرکھپ بھی گیا ہو گا۔اس کے آسرے اس کو کب تک بٹھاؤ گے؟" فاروق تایا لاتعلق انداز

میں کہنے لگے۔ سماہا نے ہاتھ روکتے ضبط سے آنکھیں بند کیں۔ پرنیہ نے پریشانی سے ساتھ بیٹھی بہن کے چہرے کو دیکھا۔

"میرے بس میں ہوتا تو کروا دیتا اس کی شادی۔ لیکن یہ چاہتی ہی نہیں ہے کہ باپ سکون کا سانس لے سکے۔" وہ اب سماہا پر برہم ہو رہے تھے جو لب سیے بیٹھی تھی۔ چہرہ بے تاثر اور ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ پرنیہ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ وہ خاموش بیٹھی اپنی ذات کی دھجیاں اڑتے دیکھ رہی تھی۔ دستر خوان پر موجود ہر کوئی کھانا چھوڑے اب ایک دوسرے کو دیکھ رہا تھا۔

"اس کی شادی کرواؤ گے تو ہی پرنیہ کے بارے میں سوچ سکو گے۔ بس اب تم اس کے لئے رشتہ دیکھنا شروع کرو۔ اس کے شوہر نے آنا ہوتا تو بہت پہلے آچکا ہوتا۔" فاروق صاحب نے سماہا کو شعلہ اگلتی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ یہ اس گھر کی سب سے سرکش لڑکی تھی۔ جو ایک بار کہہ دیتی تھی وہ کر کے رہتی تھی اور ان کو وہ اسی وجہ سے بری لگتی تھی۔ انہیں زیادہ آزاد خیال عورتیں سخت ناپسند تھیں۔

"جیسا آپ کہیں بھائی جان۔اب اس معاملے کو حل ہو ہی جانا چاہیئے۔" منیر صاحب نے کچھ بھی سوچے بغیر ہر بار کی طرح ان کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔سماہا نے ایک جھٹکے سے گردن اٹھائی تھی اور ایک نظر سب کو دیکھا تھا۔اس کی آنکھیں ہلکی سی نم تھیں لیکن چہرے پر غصہ پھیلا تھا۔

"میں ایک شادی شدہ عورت ہوں ابا۔آپ کو ایسی بات کرتے ہوئے حیا نہیں آئی؟" اس نے بھیگی آنکھوں سے افسوس اور ناامیدی سمیٹے کہا۔اس کی آواز کانپتی تھی۔ابا جب بھی ایسی بات کرتے تھے اس کے حوصلے خاکستر ہو جاتے تھے۔

"تمہارا آدمی آٹھ سالوں سے غائب ہے بی بی۔آخر تم اس سے آگے کیوں نہیں بڑھ جاتی؟" ابا کی بجائے جواب تایا کی طرف سے آیا تھا۔اس نے آنکھوں کا رخ ان کی جانب موڑا۔

"میں اس سے آگے نہیں بڑھوں گی تایا۔اس کے نکاح میں تب تک رہوں گی جب تک وہ خود آکر مجھے طلاق نہیں دے دیتا۔اس کے علاوہ اگر کسی نے میرے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی تو میرے اگلے قدم کا ذمہ دار وہ خود ہو گا۔" اس نے حتمی لہجے میں تایا کے چہرے پر آنکھیں جمائے مضبوطی سے کہا اور پلیٹ پرے کر کے دستر خوان پر سے اٹھ گئی۔

"اس کا دماغ آج سے نہیں آٹھ سال پہلے سے خراب ہے۔پتا نہیں کیا پھونک کر گیا تھا اس پر وہ منحوس!" اس نے اپنے پیچھے امی کی آواز سنی۔آنسو جو تب نہیں نکلے تھے اب بہہ نکلے لیکن وہ تیز تیز قدم اٹھاتی برآمدے سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف آئی۔دروازہ کھولتے ہی وہ سیدھا اپنے میز کے قریب گئی تھی۔دراز کھولتے ہوئے اس نے اندر سے ایک چیز نکالی۔یہ ایک چھوٹا سا بٹنوں والا موبائل تھا جو کافی سالوں سے بند پڑا تھا۔اس نے بٹن دبا کر اسے آن کیا۔موبائل کی لائٹ جلی تو اس نے الٹے ہاتھ سے اپنے بہہ جانے والے آنسو بے سردی سے پونچھے۔ابا کی باتوں سے آج اسے وہ قدم اٹھانا پڑ گیا تھا جسے اٹھانے سے وہ خود کو کئی سالوں سے روکے ہوئے تھی۔اس نے متعدد بٹن دبا کر ایک نمبر ڈائل کیا اور موبائل کان سے لگایا۔اس کے ہاتھ ایسا کرتے ہوئے کپکپا رہے تھے۔آج وہ خود کے ارادوں کو خاک میں پھینک دینے والی تھی۔اسے لگا کہ اس کے اتنے سالوں کی تڑپ جیسے آج ضائع ہونے والی ہے۔وہ انتظار جو اس نے قفل لگی زبان کے ساتھ کیا تھا وہ آج رائیگاں جانے والا تھا۔کپکپاتے ہاتھوں نے مضبوطی سے موبائل تھام رکھا تھا۔گلے میں کانٹے اگ آئے تھے۔کیا وہ واقعی ایسا کرنا چاہتی تھی؟

کال مل چکی تھی۔ بیل جا رہی تھی۔ وہ بار بار اپنے آنسو رگڑتی لیکن وہ پھر سے بہہ نکلتے۔ بلآخر اس نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ دوسری جانب چھٹی بیل پر کال اٹھالی گئی تھی۔ سماہا کی سانس یکدم رک گئی۔ اسے لگا جو وہ کہنے والی ہے اس سے پہلے ہی وہ مر جائے گی۔ اس کا بدن آہستہ آہستہ کانپ رہا تھا۔ جذبات بری طرح اس پر حاوی تھے۔ وہ جو کبھی مایوس نہیں ہوئی تھی آج بکھرنے لگی تھی۔ اسی لمحے پرنیہ بھاگ کر آتے ہوئے دروازے کے فریم میں نمودار ہوئی۔ سماہا نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اور پھر سماہا منیر کے ہونٹ ہلے۔

"مجھے طلاق چاہیئے۔۔۔!" الفاظ اس کی زبان سے نکلے اور کمرے میں ان کی گونج پھیل گئی۔ سماہا کا کان سے لگا ہاتھ نیچے آگرا۔ وہ زار و قطار روتے ہوئے کرسی پکڑے نیچے بیٹھتی گئی۔ اس ایک جملے نے اس کے وجود کی ساری قوت نگل ڈالی تھی۔ پرنیہ دروازے کے فریم میں منہ پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ سماہا کو شدید حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ یہ اس نے کیا کر ڈالا تھا؟ سماہا اب گھٹنوں میں سر دیے رو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موجود فون اب زمین پر گرا ہوا تھا۔ پرنیہ نے زمین پر گرے فون کو دیکھا۔ اس کی چھوٹی سی سکرین پر کسی کا نام چمک رہا تھا۔

"راحب حسین۔"

حسابِ عمر کا اتنا سا گوشوارا ہے
تمہیں نکال کہ دیکھا تو سب خسارا ہے

(امجد اسلام امجد)

ناولز کلب
Clubb of Quality Content

جاری ہے۔

اگلی قسط آئندہ ماہ۔

مزید بہترین ناول/افسانے/آرٹیکل/مختصر کہانیاں اور معیاری شاعری پڑھنے کے لئے نیچے دیئے گئے لنک پر کلک کریں۔

شکریہ!

www.novelsclubb.com

ہماری ایپ ڈاؤنلوڈ کریں اور رسائی حاصل کریں بے شمار مزے دار ناولوں تک

Download our app

Clubb of Quality Content

اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔تو ہم سے رابطہ کریں۔

ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔

آپ اپنا لکھا ہوا ناول، افسانہ، شاعری، ناولٹ، کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں ورڈ فائل یا ٹیکسٹ فارم میں میل کریں

novelsclubb@gmail.com

آپ ہمارے فیس بک، انسٹا پیج اور واٹس ایپ کے ذریعے بھی ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

FB PAGE:

NOVELSCLUBB

INSTA:

NOVELSCLUBB

WHATSAPP:

03257121842